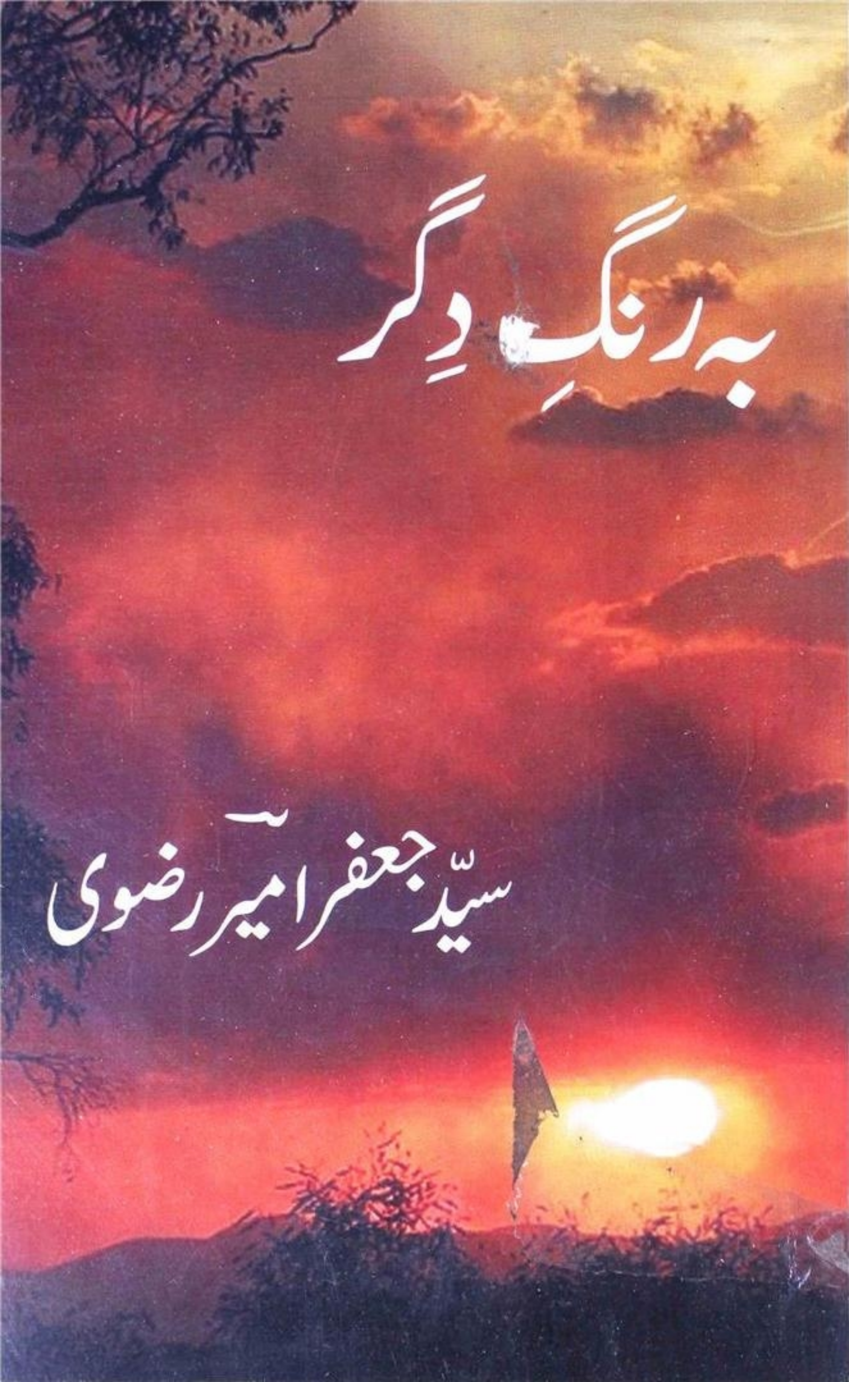

بہ رنگِ دِگر

سیّد جعفر آمیر رضوی

سید جعفر امیرؔ رضوی مشاہیر کی نظر میں:

سلطانہ مہرؔ۔ انگلستان: سید جعفر امیر قلبی وارداتوں اور داخلی کیفیات کی ترجمانی کرتے ہیں۔ وہ کائنات کے ہر ذرّے میں حسنِ قدرت دیکھتے ہیں جس کی وہ ترجمانی کرتے ہیں۔ انکے پاس عشق بھی ایک ہمہ گیر اور کائناتی رنگ لئے ہے۔

نذیرؔ فتح پوری۔ پونا: سید جعفر امیر اپنی طرز کے واحد شاعر ہیں۔ یہ منظر اور موسم کے شاعر ہیں ان کی پابند نظمیں اندھیرے میں چراغ جلانے کا ایک ایسا عمل ہے جو دور تک اور دیر تک روشنی پھیلانے کا کام کرے گا۔ ان کی شاعری پڑھ کر آپ واہ کا نعرہ بلند کریں گے۔ سید جعفر امیر کی نظموں کی تفہیم کیلئے ایک مکمل کتاب کی ضرورت ہے۔

عبدالمجید سرورؔ: نیچر یا الطبیعہ کی شاعری میں جعفر امیرؔ رضوی کو خصوصی درک حاصل ہے۔ برسات کی رات ’آمد باراں‘ ستارے وغیرہ الطبیعہ یا نیچر شاعری کا مسٹرپیس حسن ہیں۔ انکے علاوہ سید جعفر امیرؔ رضوی کے شعری جواہراتِ فن میں تاثراتی یا وارداتِ قلبی کی شاعری کا بھی بہت زبردست خزانہ ہے۔

عتیق احمد عتیقؔ: نیچر یا الطبیعہ شاعری کو نظیر اکبر آبادی کے بعد اگر کسی نے مثبت اور منضبط انداز میں پیش کیا ہے تو وہ سید جعفر امیرؔ ہیں۔ ان کی فکر انگیز نظمیں نیچر اور فطرت کی عکاسی میں اپنا جواب آپ ہیں۔ ان پر مستزاد یہ کہ انھوں نے گوناں گوں فطری مناظر کو جن لفظیاتی آہنگ کے ساتھ پیش کیا ہے وہ ایسا کارنامہ ہے جس پر دوامی کی مہر لگ گئی ہے۔

فہرست	صفحہ نمبر
ناوک نے پھر ابرو کو کس شان	۳۱۴
فکرِ دوراں میں نہ ہستی کو	۳۱۶
کالے بالوں میں سفیدی سی	۳۱۸
ہے پوشاک ان کی گلابی گلابی	۳۱۹
عنابی جامۂ احمر ہے گل بدن	۳۲۱
پھرتے ہیں ڈھونڈتے ہوئے	۳۲۲
غزل کہی ہے اثر فتنہ گر پہ ہو کہ نہ ہو	۳۲۳
شوریدہ دل ہے ہم کو نہیں	۳۲۵
اب سوچ لیا میں نے،	۳۲۷
کیوں خیالوں میں یار آتا ہے	۳۲۹
طالب نرمیٔ گفتار ہوں، گفتار نہیں	۳۳۱
راہ ہم کو کوئی نظر آتی	۳۳۳
بذلہ سنجی سے ہے تعریف	۳۳۴
دل کا چراغ آتشِ گل سے جلا لیا	۳۳۵
یہ بتاؤ کہ ستائے کو ستاتے کیوں ہو	۳۳۷
جاتے ہیں مے کدے میں	۳۳۹
پرندوں کے چہکنے کی صدائیں	۳۴۰
وصل کی رات سلگتے ہوئے	۳۴۲
قامت ہے سرو کی، تو ہے	۳۴۳
دکھانے دوسروں کو زخم ہم	۳۴۴
کیا عہدِ محبت کا افسانہ بیاں کرتے	۳۴۵
قصور ہوگا کسی کا، سوال کیا کیجئے	۳۴۶
ادا حسین ہے کچھ ایسے مسکرانے کی	۳۴۷
وفورِ عشق سے کچھ ایسے	۳۴۹
شمعِ سوزاں سے جب عشق	۳۵۰
وہ ملاقات خوشگوار نہیں	۳۵۱
دل لگانے کی بات کرتے ہو	۳۵۳
راہوں کے سنگ و خار مغیلاں	۳۵۵
گنجے کو بال، رند کو میخانہ چاہئے	۳۵۷
دیکھا ہے یہی اس دنیا میں،	۳۵۹
امید کے شعلہ کو بجھایا نہیں جاتا	۳۶۰
صنم خانے کہاں ہوں گے	۳۶۲
اذنِ رفوئے دامنِ ہستی اگر ملے	۳۶۳
دوست بھی ہو کے سب انجان	۳۶۵
ادائے حسن گلگوں سے	۳۶۷
جتنی کوشش بھی کروں تجھ کو	۳۶۹
اب بھی جلتا ہے مرے دل میں	۳۷۱
تسبیح کے ساتھ ساتھ یہ	۳۷۲
آدمی کشتۂ آلام پریشاں کیوں ہے	۳۷۳
یہ تجربات بھی دنیا میں	۳۷۴
وہ زلفوں سے دل کو جہاں	۳۷۶
آئینہ رکھ کے سامنے،	۳۷۸

وہ نہ جانے اب کہاں ہے اس بھری برسات میں
وہ بھی روتا ہے کبھی کیا شدّتِ جذبات میں

فاصلہ گو مُدّتوں کا درمیاں میں آ گیا
کیوں خیالِ جانِ جاناں دل پہ میرے چھا گیا

وہ زمانہ اب کہاں جو بھائے تھی ساون کی رُت
کیا پتہ تھا آگ سی بن جائے گی ساون کی رُت

کوکتی کوئل ہے کیوں، کیوں آگئی ساون کی رُت
کیوں برستی ہے گھٹا، کیوں چھا گئی ساون کی رُت

یادِ رفتہ خون بن کے آنکھ سے بہنے لگی
آئی جو برکھا تو دل میں آگ سی جلنے لگی

دورِ باراں رحم کر! اس دل میں اب طاقت نہیں
ابرِ نیساں تو چلا جا میری دنیا سے کہیں

کھینچ دی تصویر ساون کی یہاں اشعار میں
پھول جیسے چُن دیے ہوں ریختی کے تار میں

کون سمجھے گا تری اِس شاعری کو اے امیرؔ
اب نہیں ہیں اگلے وقتوں کے یہاں پیرانِ پیر

☆☆☆

قطعہ

نظر کا شوق بڑھتا جا رہا ہے
دلِ بیتاب تڑپا جا رہا ہے
گلے ملتی ہے طفلی سے جوانی
جنونِ عشق چڑھتا جا رہا ہے

☆☆☆

موسمِ بہار

بانگِ مرغاں ہے چمن میں، اک نویدِ نو بہار
پھر سے آتا ہے ادھر کو کاروانِ سبزہ زار
لہر ہے اک تازگی کی، ہے فضا میں اک نکھار
دوشِ گردوں سے جو اترا فصلِ سرما کا غبار

سُوکھی شاخوں کی رگوں میں تازگی آنے لگی
تُخمِ خُفتہ میں نمودِ زندگی آنے لگی

تر ہوئی جو آبِ نیساں سے گِلِ دشتِ فراخ
دُوب کی پتی نے چیرا سینہ ہائے سنگلاخ
بارشوں سے گُل بداماں ہوگئے ایوان و کاخ
کونپلیں نکلیں تو تازہ ہوگئی مُرجھائی شاخ

پتہ پتہ، بُوٹا بُوٹا، سج رہا ہے سبزہ زار
ہوگیا ہے نیلگوں سا دُور پر وہ کوہسار

دشت و میداں پر بچھا ہے نَضرتی قالین سا
مخملی دھاگوں سے خس کے، دستِ قدرت نے بنا
بستیوں کے قُرب میں ہے، ریشمی گندم اُگا
خرمنوں میں لہلہاتی چل پڑی سُوندھی ہوا

آب پاشی کھیت کی اب کر رہا ہے کاشت کار
باغباں کو گلشنوں کی خوش نمائی سازگار

جب چلی بادِ بہاری گلشنوں کے درمیاں
پھول کلیاں بن گئیں، رنگیں ہوا سارا سماں
کسقدر شمشاد، بیلا، موگرا ہیں زرفشاں
جاویداں پھر ہو گیا ہے ان گُلوں سے بوستان

اُسطرف جنگل میں ارنا پھول کی آئی بہار
ہو گیا جنگل میں منگل، چھٹ گیا گرد و غبار

ہو رہی کیسی بنفشی دھوپ کی برسات اب
آسماں پر ہے شُعاعِ زر کی اِک بارات اب
گنبدِ اَفلاک پر ہے نیلگوں بانات اب
اَبر پاروں کے ہیں کیسے تیرتے نغمات اب

دیکھنے سے کثرتِ انجم کو اُڑ جاتے ہیں ہوش
رات کی رانی سے ہوتی ہے فضا بادہ خروش

ہے شمیمِ گُل سے عنبر بیز جو بادِ نسیم
رقص و وجداں میں ہے بھونرا، گلشنوں کا وہ ندیم
کوکتی کوئل ہے بَن میں، باغ میں طائر کلیم
ناچتا ہے مور پھیلا کر پرُوں کو خوش وَسِیم

گلشنوں میں نغمہ آرا پھر سے بُلبل ہو گیا
یعنی پھر سے اشتہارِ موسمِ گُل ہو گیا

☆☆☆

موسمِ گرما

ہے فضا کچھ مضمحل سی، موسمِ گل جا رہا
تابشِ خورشیدِ تاباں لے کے گرما آ رہا

پھر زمیں پہ رفتہ رفتہ شدّت گرمی بڑھی
جا چکی بادِ بہاری، بادِ صرصر چل پڑی

آخری موسم کی کلیاں سُوکھ کے مرجھا گئیں
تھے جو سبزہ زار اُن پر زردیاں سی چھا گئیں

کل تلک جو باغ تھے وہ آج خالستان ہیں
ندیاں سُوکھیں تو جنگل مثلِ خارستان ہیں

ابتدائے روزِ گرما ہاں مگر ہے خوشگوار
خنکیٔ شب سے سحر پر آ گیا ہے اک نکھار

صبح دم کی تازگی سے ہے عجب دُودِ گُہر
مشرقی کرنوں کی زد میں گھاس پر شبنم گُہر

کب رہی خنکی سحر کی جب ہوئی پہلی پہر
ہوگیا احساس کتنی تیز ہوگی دوپہر

شدت گرمی بڑھی، خالی ہوئے بازار سب
کیا خریداری کرے جو پیاس سے ہو جاں بلب

آبِ میوہ بیچتے ہیں راہ میں زیرِ شجر
برف کی ہے سِل جو لپٹی بھُوس میں رکھی ادھر

دوپہر آئی تو لوٹے کام سے کارندے سب
آدھے دن سے گھر کو لوٹے مکتبوں سے بچے سب

سہ پہر، پَیلاق میں قَیلُولہ کرتے ہیں امیؔر
سایۂ اشجار میں سوتے ہیں مفلس اور فقیر

سو کے اُٹھیں شام کو تو شدّتِ گرمی ہو کم
جب چلی ٹھنڈی ہوا تو رات ہو جاتی ہے نم

آسمان پر پھر ستاروں کا چمن آباد ہو
جو جُھلس جاتی ہے دن کو، روح وہ پھر شاد ہو

آم کھاتے ہیں کبھی، تربوزے، خربوزے کبھی
کوری مٹی کی صراحی کا پئیں پانی سبھی

تخت پر سوئے صحن میں، قصے ہوتے ہیں بیاں
یا تصور میں کسی کے دیکھتے ہیں آسماں

اب کہاں فُرصت کے وہ دن، عشق کی راتیں کہاں
اب ہزاروں آفتوں کے طوق میں ہے ایک جاں

موسمِ خزاں

رُوئے عالم پر عیاں ہے ایک افسردہ وُجود
بادِ آوارہ کی خُو میں آ گیا ہے کیا جُمود!
ہے عجب سی کیفیت کا ان عناصر میں نمود
صبح دم ہوتا نہیں ہے اب پرندوں کا دُرود

گُلشنوں سے رحمتِ بادِ بہاراں اُٹھ گئی
فصلِ گُل کی آخری پھولوں کی ٹہنی لُٹ گئی

سبزگی میں اب وہ پہلی سی کوئی رونق نہیں
سُرمئی رنگت لیئے ہے اب ترائی کی زمیں
حاشیے ہی رہ گئے ہیں کشت زاروں کے کہیں
موسمِ گُل جارہا تھا، اب خزاں تھی جانشیں

رنگتوں میں رنگتوں کا میل اب ہونے لگا
دستِ گردوں تُخمِ تبدیلی کے اب بونے لگا

اس طرح سرسبزیٔ اشجار مدّھم ہوگئی
جیسے ہستی کی بساطِ لطف برہم ہوگئی
پتّیوں کے رُخ پہ پیلاہٹ مصمّم ہوگئی
سُرخیاں ابھریں تو زردی اُنکی محرم ہوگئی

جنگلوں پر گر رہی تھی رنگ کی ہلکی پھوار
آگئی ہو پھر سے جیسے آتشیں گُل کی بہار

رفتہ رفتہ پتّیاں مُرجھا کے ژولیدہ ہوئیں
تھیں جہاں پرسایہ افگن، گر کے خوابیدہ ہوئیں
ڈالیاں پھر برگ ریزی سے تراشیدہ ہوئیں
ٹُھنٹھ باقی رہ گئے، کلیاں بھی غم دیدہ ہوئیں

آ رہی تھی سوز خاموشی میں پت جھڑ کی صدا
رُخصتی کا گیت جیسے یا جرس کی ہو نوا

فہرست	صفحہ نمبر	فہرست	صفحہ نمبر
بیٹھیں ہیں رہ گزر پر،	۳۸۰	مسدسات	۳۹۸
تیرگی رات کی جب حد	۳۸۱	قطعات	۴۰۹
تھا میں محفل میں مگر تنہائیاں	۳۸۲	ابیات	۴۳۸
ہر خوشی دل سے بہت دور	۳۸۳		
اپنے خیال و خواب میں	۳۸۴		
اے شکوہ گو، اے نکتہ چیں،	۳۸۵		
بات جانے کیا ہوئی،	۳۸۶		
ساقیا، اور گھٹا نہ رہے شام و سحر	۳۸۷		
وہ ہاتھوں سے چھینیں نہ	۳۸۸		
ژولیدگی خزاں کی جو پھیلی	۳۸۹		
بیٹھے بیٹھے مسکرا دیتے ہیں وہ	۳۹۰		
پھول یادوں کا خیالوں میں مہکتا	۳۹۲		
جب اٹھی پس پردہ نظر	۳۹۳		
یاد کیا کیا تھی، دہایا نہیں بھول گئے	۳۹۴		
آمادہ تو تھے آئیں گے	۳۹۵		
اس کا انداز تغافل ہم کو کیوں	۳۹۷		

شور ہوتا اب پرندوں کا نہیں ہے صبح دم
دامنِ صحرا ہوا ہے اُوس کے قطروں سے نم
ضُو، جبینِ آسمانِ مشرقی پر اب ہے کم
اور دریا کے کنارے ہے کُہر کا پیچ و خم

اس خزاں کی دوپہر بھی ہے لیئے خاموشیاں
سرمئی سے دُھندلکوں میں شام کی سرگوشیاں

ہے سُکوں بھی، درد بھی ہے پائیزی ماحول میں
اک سلونا سا اثر ہے منظرِ انمول میں
کیفیت دل کی بیاں کیسے کروں دو بول میں
نقد اتنا بھی نہیں الفاظ کے کشکول میں

دَور میری زندگی کا ہے لئے رنگِ خزاں
اک سُکوں سا پا رہا ہوں اس لئے بیٹھا یہاں

میں اکیلا ہی یہاں نقشِ جہاں دیکھا کروں
پیڑ سے ٹیکا لگائے یہ سماں دیکھا کروں
خار و خس اُڑتے ہوئے، بادِ رواں دیکھا کروں
عکسِ ہستی ان مناظر میں نہاں دیکھا کروں

زندگی کا موسمِ بے کیف پھر جاری ہوا
فصلِ گل رُخصت ہوئی، افسونِ غم طاری ہوا

☆☆☆

قطعہ

جب کبھی ہوتا، غزل نوا کوئی
یاد اُس کی امنڈ کے آتی ہے
نام اُس کا کبھی جو سنتا ہوں
میری ہستی بکھر سی جاتی ہے

☆☆☆

موسمِ سرما

لو، ہَوا چلنے لگی سردی کا موسم آ گیا
ملگجا سا رنگ کیسے آسماں پر چھا گیا

جھاڑیاں پوشاکِ برگِ سبز سے عاری ہوئیں
ظُلمتیں اِس موسمِ سرما کی اب جاری ہوئیں

اِک اُداسی کا ہے عالم دُور تک چھایا ہوا
آمدِ طوفاں سے پہلے کا سکوں پھیلا ہوا

صبح کی رنگینیاں او شام کے وہ پیرہن
صرفِ آشوبِ زمستاں ہو گئے وہ دفعتاً

سر جھکائے، پیلے کپڑے پہن کر دورِ خزاں
جا رہا تھا جیسے گھر کو لوٹتا ہے پاسباں

موسموں پر بھی ہیں واجب وقت کی پابندیاں
ہے تغیر فطرتِ عالم، نظامِ آسماں

سُوکھے پتے اب زمین و خاک میں ملنے کو ہیں
پھر شمالی سرد جھونکے جو اِدھر آنے کو ہیں

آٹھ کی شکلیں بنائے، رُخ کیے سمتِ جنوب
دیکھیے پرواز میں مرغابیاں وقتِ غروب

دلکشی کیسی ہے، کیسا حُسن ہے پرواز میں
نغمۂ آزادی ہے گونجا ہوا آواز میں

کُہر سا رہنے لگا ہے اس طرف کچھ شام سے
صبح بھی کچھ کپکپاتی آرہی ہے بام سے

کھڑکیوں پر رات میں تہہ برف کی جمنے لگی
ندیوں کے دامنوں میں دُھند سی رہنے لگی

پھر ہَوا اِک شب کو اتنی زور سے چلنے لگی
روئی کی صورت سے برفِ نقرئی گرنے لگی

وہ ہوا کا زور تھا، ہر سُو شجر ہلنے لگے
تیرگی بڑھنے لگی، دیوار و در ہلنے لگے

صبح جب دیکھا زمیں کا رنگ تھا بدلا ہوا
ہر طرف اِک جھاگ سا ہے دُودھ کا اُبلا ہوا

آسماں نیلا، فِضا اپنی جگہ بے ہوش ہے
کوئی طوفاں کا اثر ہے، نہ ہوا کا جوش ہے

ٹہنیاں جُھک کر نظارہ کرتی ہیں اشجار سے
برف، بوندیں بن کے گرتی ہیں جو نوکِ خار سے

سر اٹھائے یہ صنوبر کی قطاریں دور تک
سنگِ مَرمَر کے ستونوں کی دیواریں دور تک

ہوگئی ہے اس طرح سے برف، اُن پر جم کے سخت
جگمگاتے جھلملاتے جیسے شیشے کے درخت

خیرہ ہوتی ہیں نگاہیں یہ سفیدی دیکھ کر
ہے چمکتی دُھوپ کا ایسا اثر ماحول پر

موسمِ سرما کی پہلی برف کو اب دیکھنے
لوگ باہر آرہے ہیں اور بچے کھیلنے

کھیلتے ہیں برف کے گولوں سے جب بچے کہیں
کہتی ہیں مائیں کہ بچے آج تو بس میں نہیں

سُرخ عارض ہوگئے اور ہاتھ بھی نم ہوگئے
کھیل میں تکلیف کے احساس بھی کم ہوگئے

سانس جو لیجئے ٹپک جاتا ہے پانی ناک سے
بات جو کرتے ہیں نکلے منہ سے بادل بھاپ کے

دُھوپ کی رونق کہاں جو چُھپ گیا ہے آفتاب
منہ چھپائے اب چلا جاتا ہے شمسِ بانقاب

برف کی پہلی سفیدی اب کہیں باقی نہیں
ملگجا سا ہو گیا ہے دور تک فرشِ زمیں

دن جو چھوٹے ہوگئے ہیں رات لمبی ہوگئی
رُوح افزا روشنی بھی آسماں سے کھو گئی

جسم کو اپنے سکیڑے، سر جھکائے لوگ اب
اِکّا دُکّا ہی نظر آتے ہیں جب آتی ہے شب

گھر میں سردی بڑھ گئی، برفاب بھی جمنے لگا
اور نلوں میں سرد پانی رات میں جمنے لگا

فرش پر پاؤں بڑی مشکل سے رکھا جائے ہے
نہ کھڑے رہنے کی ہمت نہ تو بیٹھا جائے ہے

صدریاں پہنے ہوئے ہیں، شال بھی اُوڑھے ہوئے
بیٹھ جاتے ہیں کبھی سب ہاتھ کو جوڑے ہوئے

منہ جو دُھوتے ہیں تو جیسے مار دے تھپڑ کوئی
ہاتھ ملتے، کپکپاتے پھر رہے ہیں، ہاں سبھی

ہر کوئی کہتا ہے ہائے! آگ کیوں جلتی نہیں
اس قدر سردی ہے اپنی دال اب گلتی نہیں

شعلۂ آتش کا رقص بیکراں ہونے لگا
بیٹھ کر کرسی پہ کوئی ناولیں پڑھنے لگا

گفتگو ہونے لگی، قصّے کہے جانے لگے
مونگ پھلی بستروں میں لیٹ کر کھانے لگے

قصہ آتشی تھا، باتوں میں مزا آنے لگا
جب کہانی بھوت کی کوئی بڑا کہنے لگا

پھر، پُھریری لے کے قصّے سانپ کے سننے لگے
جو شکاری تھے وہ قصّے شیر کے گڑھنے لگے

جب کبھی آواز باہر سے کسی کی آئے ہے
بچّہ پہلو میں بڑوں کے اور کھسکا جائے ہے

رات جب گہری ہوئی تو نوجواں سونے لگے
شادیوں کے، عشق کے، قصّے بیاں ہونے لگے

دیر تک باتیں شبِ سرما میں بس ہوتی رہیں
پیالیوں پر پیالیاں بھی چائے کی چلتی رہیں

دل کی باتیں جو اشاروں میں ادا ہوتی رہیں
ہم تڑپتے تھے اِدھر اور وہ بھی شرماتی رہیں

یاد ہیں وہ سردیوں کی شب کی باتیں یاد ہیں
رونقِ محفل تھی جن سے اب کہاں آباد ہیں

☆☆☆

نظمیات:

رنگ ہائے نظائر

اور یہ حُسنِ مناظر، یہ زمین اور تارے
بہتے دریا، یہ سمندر، یہ پہاڑوں کا اُبھار
پہلی برسات کی سوندھی سی وہ مٹّی کی مہک
چاہتا تھا کہ کروں نظم، بہاروں کا نکھار

(نظم: مصنف)

دل ہے بے چین، اِدھر شام سے آنکھیں بھی ہیں نم
پھر مرے سامنے رکھ دو مرے قرطاس و قلم

سید جعفر امیر رضوی

جُھٹ پٹے کا وقت

جُھٹ پٹے کا وقت ہے، ہے سرمئی سا آسماں
دُور مغرب میں ابھی ہے ایک سُرخی سی عیاں

اک سکوتِ پُر اثر ہے دُور تک چھایا ہوا
اُوج پر اُٹھتا دھواں کچھ پیچ و خم کھایا ہوا

طوق میں اپنے سیاہی گھیرتی جاتی ہے اب
دُھندلے دُھندلے ہو رہے ہیں نقشِ دنیا بامِ شب

وادیوں میں شام کچھ پہلے ہی گہری ہو گئی
رفتہ رفتہ روشنی اس آسماں سے کھو گئی

☆☆☆

چاندنی رات میں سمندر کا منظر

رات سوئی ہوئی، خاموش فضاؤں کا سکوت
ماہِ تاباں سے برستی ہوئی سونے کی پھوار
نُور کی سلوٹیں بہتی ہوئی، ساحل کی طرف
ریت پر ایک تسلسل سے ہے موجوں کا اُتار

کتنے احساس جگاتا ہے یہ شب کا منظر
آؤ، آؤ، اِدھر آؤ، ذرا دیکھو تو اُدھر

ان چٹانوں کی بلندی سے نظر کی وُسعت
دُھندلے دُھندلے سے سلگتے ہوئے تاروں کے چراغ
ابر پاروں کے ہیں دامن میں طلائی ڈورے
مست و مخمور بنا دیتے ہیں منظر کے ایاغ

ایک خنکی سی تراوٹ سی ہے ہلکی ہلکی
ان ہواؤں میں سمندر کی ہے خوشبو مہکی

کیسے موجوں کا ہے ایک سلسلۂ لافانی
جانے آتی ہیں کہاں سے یہ کدھر جاتی ہیں
ہر تھپیڑے سے صدا اُن کی بلند ہوتی ہے
جھاگ اڑتا ہے جو ساحل پہ بکھر جاتی ہیں

کرۂ آب سے اک نغمہ سوا ہوتا ہے
موج کے تار پہ مضراب ہوا ہوتا ہے

جو نظر آتا ہے دلکیف فضا کا منظر
نہ رہے گا یہ عناصر کا تناسب دائم
حُسن کامل کو نہیں نکتۂ کامل پہ قیام
پھر بھی آنکھوں میں ہر اک نقش رہے گا قائم

پیار کے جذبے کو ہے حُسنِ مناظر سے ثبات
ایک ہوجائیں گھڑی بھر کو یہاں آج کی رات

☆☆☆☆

چودھویں کا چاند

موسمِ باراں ہے اُس پر چودھویں کا چاند ہے
چرخِ اول پر جھلکتی کہکشاں بھی ماند ہے

بادلوں کے بیچ میں ہے چاند کی کشتی رواں
ابر کے آوارہ ٹکڑوں کا چلا ہے کارواں

ابرقی رنگت ہے دی اُن بادلوں کی روئی کو
ہے شلوکہ ابر کا پہنے ہوئے دل جوئی کو

کس قدر دلکش فضا کو اُس نے آ کر کر دیا
بادلوں کے دامنوں میں جیسے سونا بھر دیا

حُسن پیکر بن گیا ہے اک نئے انداز سے
کر دیا ہے ظلمتوں کو نُور اپنے ناز سے

جب چھٹے بادل تو آئی پھر چمک سی ماہ میں
جیسے کوئی رُک گیا ہو چلتے چلتے راہ میں

عرش پر تارے نظر سے اور اوجھل ہو گئے
دیکھ کر اُس ماہِ تاباں کو وہ جیسے سو گئے

کس قدر مسرور ہوتا چاندنی کی رات سے
عہد و پیماں تھے جوانی کے تری ہی ذات سے

جانے تجھ کو دیکھ کر کیوں آج گھبراتا ہوں میں
ہوک سی اٹھتی ہے دل میں اور کھو جاتا ہوں میں

☆☆☆

رات کے پچھلے پہر کا چاند

سہ پہر رات کا، اعصابِ عناصر سوئے
جادۂ شب کے مسافر بھی تھکے ہارے تھے

چاند کاہیدہ تھا، دُھندلا سا، قریبِ منزل
دُھندلے دُھندلے سے فلک کے بھی گہر پارے تھے

پُرفسوں ہونے لگی تھی شبِ آخر کی گھڑی
وقت ستانے کو جیسے کہ کہیں رُک سا گیا

نہ تو آواز، نہ آہٹ، نہ ہی حرکت، نہ عمل
بجھ گیا تھا ہر اک اجرامِ شبستاں کا دیا

تھا سفر وادیٔ گمنام کا، ہر نقشِ جمیل
ایسے دُھندلے تھے کہ ہوں خواب کے سوئے منظر

یوں لگا مجھ کو کہ دنیا میں کوئی اور نہیں
جیسے سنسان سی بستی پہ ہو جادو کا اثر

وقت بے معنی ہوا رشتۂ دنیا ٹوٹا
نہ رہا دردِ محبت نہ وہ حسرت کا غبار

ایسے احساس اٹھے جن کو بیاں کر نہ سکوں
ایسے جذبے کہ حقیقت پہ نہ تھا جن کا مدار

وہ جو جاگا تھا بڑی دیر سے پہلو میں مرے
سو گیا طولِ مسافت سے پریشاں ہوکر

اُس کو معلوم نہ تھا میں نے کیا تھا جو سفر
روزِ روشن کے حقائق سے گریزاں ہوکر

☆☆☆

ستارے

فلک پہ دیکھئے بکھرے ہوئے ستاروں کو
پھوارِ نور سے بھیگے ہوئے نظاروں کو

عجب یہ حُسن ہے تاریکیوں میں پَرتو کا
سوادِ شب میں ذرا دیکھئے شراروں کو

ہیں کہکشاں یہ کبھی اور کبھی ثریا ہیں
شہاب بن کے یہ چمکائیں فلک زاروں کو

شب فراق میں ہیں ساتھ یہ مکینِ فلک
مری طرح سے کہاں نیند ماہ پاروں کو

کبھی تو ذوق نظر سوئے آسماں کر لو
دلی زبان سے کہتے ہیں خاکساروں کو

پریشاں راہ سفینوں کو بحر طوفان میں
بتائیں دور سے گم گشتہ وہ کناروں کو

ترے ہی واسطے روشن امیؔر رہتے ہیں
تو ہی سمجھتا ہے ان کے حسیں اشاروں کو

☆☆☆

قطعہ

رقصِ شبنم گھاس کی پتی پہ ہنگامِ سحر
نور کی کرنوں سے روشن ذرہ ذرہ آب کا
یعنی میں ہوں ایک قطرہ، آپ دریا نور کا
اس طرح کا ہو گیا ہے مجھ سے رشتہ آپکا

☆☆☆

لیمپ پوسٹ

گلی کے کونے میں جلتا ہے ایک برقی چراغ
بنی ہے جسکی حقیقت سے آبروِ شب کی
یہ انسداد ہے اک غلبۂ سیاہی کا
ہوئی جو رات تو دیکھی شمع ہے کوکب کی

بنا ہے چادرِ پرتو سے ایک ہالہ سا
بلند تاروں کے کھمبے پہ اک نگینہ ہے
اندھیری رات میں روشن کئے ہے راہوں کو
یہ بحرِ شب کے لئے جیسے اک سفینہ ہے

یہیں تو شام کو آتش پرست پروانے
ثبوتِ عشق میں دیتے ہیں جل کے اپنی جاں
وہ گوشہ گاہوں سے شب کو نکل کے آتے ہیں
فنائے شوق میں ہو جاتے ہیں وہ رقص کناں

سید جعفر امیرؔ رضوی

شخص اور شاعر

میانہ قد۔ چھریرا بدن۔ تیکھے نقوش۔ متین و سنجیدہ۔ نگاہوں میں محبت۔ لہجے میں نرمی۔ خوش اطوار۔ خوش اخلاق۔ خوش وضع۔ خوش پوشاک۔ یہ ہیں شعر و ادب کے صحت مند ذوق رکھنے والے علمی و ادبی ماحول کے پروردہ۔ خوش فکر شاعر، ادیب سید جعفر امیرؔ رضوی۔

سید جعفر امیر رضوی حیدر آباد دکن کے ایک معزز و متمول خاندان کے فرد سید منظور امین رضوی کے ہاں پیدا ہوئے۔ ویسے ان کا آبائی وطن لکھنؤ ہے۔ ابتدائی تعلیم گھر پہ حاصل کرنے کے بعد انگریزی اسکول میں داخل ہوئے۔ وہاں ان کو قابل اساتذہ میسر آئے جنہوں نے ان کی ذہانت، شوق اور خداداد قابلیت دیکھ کر ہونہار سے خاص دلچسپی لی اور ان کی فطری صلاحیتوں کو اجاگر کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا۔ ابھی وہ پانچویں جماعت ہی میں تھے کہ ایک دن اپنے والد کے پاس پہنچے اور ان سے شاعری کرنے کے اصول اور نکات دریافت کئے۔ والد صاحب جو دفتر سے آنے کے بعد آرام کرسی پر دراز اخبار کا مطالعہ کر رہے تھے۔ حیران ہو کر اٹھ بیٹھے اور اپنے لڑکے کو غور سے دیکھنے کے بعد فرمایا کہ بیٹے شاعری تو خداداد چیز ہے۔ تم ابھی تعلیم کی طرف توجہ دو لیکن اگر وقت نکال کر کبھی کبھی شاعری کرتے رہے۔ کچھ عرصے کے بعد انہوں

گلی کے کونے میں اک بازی گاہِ طفلاں ہے
عصر کو بچے یہاں کھیلنے کو آتے ہیں
قریں مکان کے، زینے پہ شام کو بوڑھے
جو گھر میں دل نہ لگے آ کے بیٹھ جاتے ہیں

جو نوجوان ہیں وہ بھی یاں یار باشی کو
اسی چراغ تلے محفلیں جماتے ہیں
تھکن مٹانے کو اپنی نشاطِ ہُو حق میں
غمِ حیات سے کچھ دم فرار پاتے ہیں

کبھی تو میں بھی وہاں جا کے بیٹھ جاتا تھا
یہ دیکھنے کو وہاں کون کون آیا ہے
فرُودِ شام میں کیا کاروبارِ بستی ہے
اِدھر اُدھر کی خبر کوئی دوست لایا ہے

چراغ و شب کا یہ رشتہ عجب انوکھا ہے
تضادِ خُو ہے مگر ساتھ ساتھ رہتے ہیں
کہ جس طرح سے مری تیرگی کی دنیا میں
ترے خیال کے اکثر چراغ جلتے ہیں

☆☆☆

قطعہ

آنکھیں اپنی بچھائے بیٹھے ہیں
کان در سے لگائے بیٹھے ہیں
کیسے بھولیں رسومِ بزمِ فراق
عود و عنبر جلائے بیٹھے ہیں

نشاطِ شب

تو کائنات کو، دنیا کے اژدہام کو دیکھ
کبھی تو خود کو کبھی حُجتِ مُدام کو دیکھ

اگرچہ دَورِ پریشاں سے ہے گرانباری
سحر کو دیکھ، نہ تو شام وہمِ خام کو دیکھ

حیاتِ فانی کے دو دن یہ بے حقیقت ہیں
جہانِ زیست کی اس سعیِ ناتمام کو دیکھ

آ، میرے ساتھ ستاروں سے بھی آگے امشب
آ، میری آنکھ سے ہر نجم کے خرام کو دیکھ

شہابِ ثاقب و کوکب ہے، نیم وا ہے قمر
فلک پہ نور کے اس جلوۂ نظام کو دیکھ

فضا میں ہلکی سی خنکی، شمیمِ شب ہے رواں
رُخِ قمر پہ ذرا ابرِ خوش خرام کو دیکھ

تو ہمکنار ہے، دل میں سکونِ دو عالم
مری دُعا کے ذرا حاصلِ تمام کو دیکھ

مبادا، دیر سے آئے کہیں نہ تجھ کو خیال
صلاح یہ ہے، ابھی راہ ناتمام کو دیکھ

تُو بُود و باش مری پوچھتا ہے کیوں آخر
خلوصِ دل کو مرے، نیّتِ سلام کو دیکھ

اُمیدِ وصل میں دل کو کیے چراغاں ہوں
اُمیدِ خام کے اس حُسنِ اہتمام کو دیکھ

شبِ حیات ابھی بامِ سحر تک آ پہنچی
فروزاں دل میں ترے شعلۂ مدام کو دیکھ

ہر ایک شعر میں پنہاں ہے میری حالتِ دل
خیالِ نو کو مرے، بندش کلام کو دیکھ

حسیں ہے سبزہ کی پتی اگر ہو ذوقِ نظر
بدلتے رنگِ فلک، وقتِ صبح شام کو دیکھ

وہ کہہ رہے ہیں کریں گے نہ بات تجھ سے امیرؔ
خیالِ ضد میں ذرا شوخیٔ پیام کو دیکھ

امیرؔ حاصلِ ہستی یہی ہے وقتِ سفر
کہیں تو رُک کے کسی منظر و مقام کو دیکھ

وقت کیا چیز ہے؟ وہ جنبشِ افلاک امیرؔ
زندگی کیا ہے؟ یہی گردشِ ایام کو دیکھ

☆☆☆

گاؤں کی رات

ظلمتِ شب ہے سیاہ پوش ہے خاموش جہاں
ہاں مری چشمِ گراں بار کو ہے خواب کہاں

شہر سے دُور کسی گاؤں میں دیکھوں میں سماں
خلوتِ شب میں چمکتے ہوئے تارے لرزاں

پُل پہ بیٹھا ہوں، سُنوں زمزمۂ آبِ رواں
ہیں کناروں پہ اُچھلتی ہوئی لہروں کے نشاں

تاروں کی دھیمی شعاعوں سے ہے منظر دِلگیر
درمیاں کھیتوں کے، راہوں کی یہ بل کھاتی لکیر

کھڑکیوں میں کہیں جلتے ہوئے خوابیدہ دیئے
زندہ وہ بھی ہیں مری طرح سے جلنے کے لئے

نبض عالم میں ستاروں کو دھڑکتے دیکھا
میں نے افلاک میں ثاقب کو بھڑکتے دیکھا

عُودِ شب جلتا رہا رات مہکتی ہی رہی
یاد اُسکی میرے پہلو میں دھڑکتی ہی رہی

حُسنِ قدرت سے سکوں ملتا ہے گو دل کو امیرؔ
اپنی تنہائی میں ہو جاتا ہوں یادوں کا اسیر

☆☆☆

قطعہ

بھورے بادل میں آفتابِ سحر
تاباں جیسے کہ بدرِ کامل ہو
کوئی شرما کے جیسے ہو گلِ نار
جبکہ چہرے پہ اُسکے آنچل ہو

☆☆☆

ڈل لیک پر سحر کا منظر

نوٹ:۔ ڈل لیک، سرینگر، کشمیر کا ایک خوبصورت تالاب ہے جس کے کنارے پر مغل بادشاہوں کے باغات جیسے شالی مار، نشاط وغیرہ ہیں۔ اقبالؒ نے بھی اپنے کلام میں ڈل لیک کی شام کا سماں کھینچا ہے۔

ادائے ناز سے لیتی سحر ہے انگڑائی
نشانِ رُخصتِ شب ہے اذانِ مرغِ چمن
اُفق کے موڑ پر اُبھری گلوں کی لالی سی
سپیدہ ہو گیا لو ارضِ مشرقی کا بدن

ہے رقصِ رنگِ فجر بادلوں کی چادر پر
کہ جیسے قوسِ قزح پھیل کر بکھر جائے
کہیں ہیں سُرخ، کہیں زرد، اور کہیں اُودے
طلائی گوٹ سی دامن پہ جیسے لہرائے

صَبا نے دیکھی جو رنگینیٔ سحر گاہی
بگوشِ گُل یہ کہا 'اے نگارِ گلشنِ ناز
اٹھو! کہ برُجِ زمیں پر ہے شمس کی آمد
اٹھو! کہ نور کا مشرق میں ہو رہا ہے نیاز

کِھلیں جو کلیاں، مہکنے لگی چمن کی فضا
فُسوں کی جیسے کُہر چھا گئی ہے عالم پر
طیور پڑھتے ہیں مل کر درود و حمد و ثنا
سکوتِ آب پر اُلٹا ہے عکسِ نقشِ شجر

کبھی جو آنکھ کُھلی شوقِ سحر خیزی میں
صبح کے رُوپ میں دیکھا جمالِ شانِ نزول
خَموش راہوں میں، صندل بکف وہ حُسنِ سحر
دِکھا رہا ہے حجابِ نظر کو اپنا اصول

☆☆☆

جنگل کی فضا

شہر آشوب سے بہتر تو یہ ویرانے ہیں
انکی تنہائی میں یک گونہ سکوں پاتا ہوں
ان ہی مدہوش سی جنگل کی فضاؤں میں کبھی
مضطرب رُوح کو ستانے چلا آتا ہوں

ایک الحانِ خموشی ہے کہ ہے ہاتفِ غیب
سرسراتے ہوئے جھونکوں سے ہے اک نغمہ رواں
خوشبوئے برگ وگلِ دشت سے مہکی ہوئی شام
آنکھوں میں لالۂ صحرائی سے بینائی جواں

گردِ افکار کو دُھوتی ہے کُہر کی نرمی
پھر سے آتی ہے رگِ جاں میں بقا کی گرمی

☆☆☆

نے اپنی پہلی انگریزی کی نظم بہ عنوان (Traveller) 'مسافر' لکھی اور اپنے والد صاحب کو بھی سنایا۔ گھر والوں نے یہ تاثر لیا کہ لڑکا کام سے گیا۔ اُس وقت ہندوستان کے حالات بڑی تیزی سے بدل رہے تھے اور مسلمان نوجوانوں کے لئے تو مستقبل بالکل ہی تاریک نظر آرہا تھا۔ ویسے بھی شاعری سے کس نے پیٹ پالا ہے؟ لیکن والد صاحب سمجھدار آدمی تھے۔ جانتے تھے کہ وہ نشہ نہیں جسے ترشی اُتار دے۔ چنانچہ منع کرنے کے بجائے انہوں نے تلقین کی کہ پہلے تعلیم حاصل کرنے میں زیادہ دلچسپی لیں اور وقت لگائیں۔ اُس کے بعد تفریح کا کچھ وقت شاعری میں صرف کریں تو بہتر ہوگا۔ سعادت مند بیٹے نے باپ کی بات گرہ میں باندھ لی اور اس کو کبھی نہ بھولے۔ بہرحال انگریزی اسکول سے میٹرک پاس کرنے کے بعد عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد میں داخلہ لیا۔ یہاں اُردو کے علاوہ دو مزید زبانیں بھی پڑھنا لازمی تھیں۔ امیر نے انگریزی اور فارسی زبانیں منتخب کر کے عبدالطیف اور ڈاکٹر عبداللہ دستگیر جیسے قابل انگریزی اور فارسی کے ماہر زبان دانوں سے استفادہ کیا۔ اپنے طالب علمی کے دور میں امیر نے درسی کتابوں کے علاوہ کلاسیکل اور ماڈرن انگریزی اور اُردو کی نثر و نظم دونوں کا بے پناہ مطالعہ کیا اور دونوں زبانوں کے لٹریچر سے شناسائی حاصل کی۔ نظام کالج، عثمانیہ یونیورسٹی سے بی۔ ایس۔ سی کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد مزید تعلیم کے لئے امریکہ آئے اور Texas A&M Univ اور University of Pensylvania یونیورسٹی سے

بَنڈِی کا سفر

گاؤں سے میں نکل کر، دیہات جا رہا تھا
بَنڈی میں بیٹھنے کا کیا لُطف آ رہا تھا

کھیتوں کے درمیاں سے جاری سفر تھا میرا
تاروں نے آسمان پر ڈالا تھا اپنا ڈیرا

سوئی ہوئی زمیں تھی، خوابیدہ آسماں تھا
کمبل کو اُوڑھے بیٹھا، گاڑی کا پاسباں تھا

بَیلُوں کی گھنٹیوں کی آواز دِلنشیں تھی
خاموشیوں میں لرزاں اک موسیقی حسیں تھی

پھیلی ہوئی فِضا میں شبنم کی اِک نمی تھی
دھانوں کی بالیوں سے خوشبو مہک رہی تھی

Prof. SHARIB RUDAULVI
COLLECTION

ٹھنڈی ہوا کے جھونکے دل کو لبھا رہے تھے
خُلدِ بریں سے جیسے ہو کر وہ آ رہے تھے

کھیتوں کے آگے جنگل کرتا تھا سائیں سائیں
مُرغانِ شب کی آتیں، رُک رُک کے تھیں صدائیں

آگے بڑھی جو شب تو گہرا ہوا اندھیرا
بوجھل تھیں میری آنکھیں، غفلت نے آ کے گھیرا

آنکھوں میں دھیرے دھیرے بچپن کی نیند آئی
پریوں نے جیسے آ کر لوری مجھے سُنائی

بنڈی میں بیٹھے بیٹھے آخر کو سو گیا میں
طولِ سفر سے تھک کے خوابوں میں کھو گیا میں

ختم سفر ہوا تو، گاؤں میں آ گیا تھا
سرگوشیوں میں نوکر مجھکو جگا رہا تھا

آنکھیں جو مَل کے دیکھا، مٹّی کا اِک مکاں تھا
خوش آمدید کہنے اک سامنے کِساں تھا

بچپن کا واقعہ یہ، یادش بخیر، اب بھی
آتا ہے یاد، دیکھوں بیلوں کی گاڑی جب بھی

گرمی کی چُھٹیوں میں گاؤں میں جا کے رہنا
یاد آپکو بھی آیا بچپن کا وہ زمانہ!

ذُوقِ نظر ہے جنکو، پڑھ کر یہ داستانیں
حُسنِ بیاں پہ میرے دیں گے مجھے دُعائیں

☆☆☆

بیت

آشفتہ سری کا یہ زمانہ نہیں جاتا
یہ سلسلۂ روز و شبانہ نہیں جاتا

☆☆☆

ریگ زار

ڈور، تاحدِ نظر اِک دشت ہے تپتا ہوا
ریت پر ان وسعتوں کی آسماں جلتا ہوا

گرد ہے اُڑتی ہوئی فرشِ زمیں کی آگ سے
ہیں بگولے خشمگیں اور پھن اُٹھائے ناگ سے

کچھ ببولوں کے ہیں بن اور کچھ کھجوروں کی قطار
ان سے سیکھیں، مشکلوں میں زندہ رہنے کا شِعار

دُور دامن میں اُفق کے، کوہسار اُبھرے ہوئے
دُھندلے دُھندلے حاشیے ہیں گرد میں ڈوبے ہوئے

ریت پر وہ کاروانوں کے نشاں مٹتے ہوئے
آب پر جیسے کسی نے لکھ دیئے ہوں حرف سے

دُور آتا ہے نظر ساحل سا، دریا موج زَن
یا نگاہِ یاس کا دُھوکا، سرابِ دل شکن

دشت کی جادوگری ہے راہروں کے حال پر
اے مسافر تو سرابوں میں بھٹکتا ہے کدھر

اک خموشی، اک سکوتِ مرگ ہے چھایا ہوا
گُنگ جیسے ہوگیا ہو، پیاس کا مارا ہوا

دشتِ ویراں میں جرس کی کیوں صدا سی آئے ہے
لُو کا جھونکا جب کبھی پہلو سے ہو کر جائے ہے

آسمانوں کی بلندی پر کہیں ایک آدھ چیل
اک نمودِ زندگی ہے درمیانِ خاک و نیل

دن قیامت کے ہیں لیکن رات ہوتی ہے حسیں
ڈوبتا خورشید جب ہے، سرد ہوتی ہے زمیں

شام اب ہونے کو آئی، مغربی محراب میں
مہرِ تاباں ڈھل رہا ہے سرخ آب و تاب میں

قرمزی ہالہ ہے تانبے کی خلائے عرش پر
بڑھ رہے ہیں عصر کے سائے قبائے فرش پر

ہوگئی خنکی، ہوا بھی نرم و نازک ہوگئی
رات کی دنیا اُجاگر، دن کی دنیا سو گئی

رات کے حشرات جاگے اور صدا دینے لگے
جگنوؤں کے چھوٹے چھوٹے سے دیئے جلنے لگے

ایک، ایک کر کے ستارے آسماں پہ آ گئے
شب کی چادر پر مثال کامدانی چھا گئے

چاند جو نکلا تو روشن دشت سارا ہوگیا
سیم کی شبنم سے یعنی شب کا سایا کم ہوا

دھیمی دھیمی روشنی میں اور بھی کچھ پُر اثر
ہوگیا منظر زمیں کا اور بھی اَسرار تر

کیا پتا تھا شام کو جب روشنی ڈھل جائے گی
آسماں پر ماہِ تاباں کی شمع جل جائے گی

بزمِ شب اتنی حسیں صحرا کی کیسے ہوگئی
نیند آتی ہے مگر کیا روحِ شاعر سوئے گی

یہ بھی ممکن ہے، ذرا دیکھیں اگر ہم غور سے
اس جہاں میں موت و ہستی بھی بنی اس طور سے

زندگی اِک روزِ صحرا، گشتہء آلام ہے
ہے فنا اک رات، صحرا گوشہء آرام ہے

☆☆☆

دو گز کا سمندر

باغِ پائیں میں جہاں حوض ہوا کرتا تھا
جمع ہو جاتا تھا برسات کا کچھ آبِ رواں
گل و گلشن کے لئے موسمِ باراں جیسے
چھوڑ جاتا تھا عقیدت میں کفالت کے نشاں

مینہ برستا تو سماں دُھل کے نکھر جاتا تھا
اُسی دو گز کے سمندر کے کنارے جاتا
پھر وہاں بیٹھ کے اسرارِ تہہٗ آبی کا
چشمِ حیراں سے بڑی دیر نظارہ کرتا

سوچتا تھا کہ کہاں سے چلے آئے حشرات
زندگی ہونے لگی کیسے یہاں رقص کناں
مچھلیوں کے یہاں یہ بچے کہاں سے آئے
سوکھ جائے گا یہ پایاب تو جائیں گے کہاں

سعی ہوتی یہ مری اُنکو میں چھو کر دیکھوں
ہاتھ پانی میں بصد شوق بڑھایا کرتا
ڈر بھی لگتا تھا کوئی کیڑا نہ کاٹے مجھ کو
آستیں بھیگ جو جاتی تو چڑھایا کرتا

پاس ہی چشمے کے کچھ پھول کھلے جو ہوتے
سنبلی فرش کے سبزے کو وہ رونق دیتے
کچھ پرندے بھی وہاں پیاس بجھانے آتے
طُولِ پرواز سے، گرمی سے جو وہ تھک جاتے

شاخ در شاخ گلہری بھی پُھدکتی آ کر
آگے بڑھتی تھی مگر ڈر کے چلی جاتی تھی
دوستی کرنے کو میں اُس کی طرف بڑھتا تھا
دُم ہلاتی تھی کبھی، پھل وہ کبھی کھاتی تھی

وہ چمن زار، وہ پایاب مری دنیا تھی
درمیاں اُن کے ہی گزرے تھے مرے لیل و نہار
حُسنِ قدرت نے نگاہوں کو بصارت دی تھی
اُن کی صحبت میں مرے ذوق نے پایا تھا نکھار

☆☆☆

قطعہ

تبسم ہے لبوں پر اور نگاہوں میں شرارت ہے
نمایاں شرم رخساروں پہ ہے رنگِ ارغوانی سے
شبابِ آتشیں اُن کو تو قدرت نے دیا لیکن
مری قسمت کہ دردِ دل ملا مجھکو جوانی سے

☆☆☆

نیوکلیر اور دیگر انجینئرنگ میں کئی ڈگریاں حاصل کئیں۔ Thermo Nuclear Fusion Research کے سلسلہ سے Princeton University سے بھی وابستہ رہے۔ انجینئرنگ اور ایڈوانس سائنس کو اپنا پیشہ بنانے کے بعد، جعفر امیر امریکہ کے سرکاری اداروں میں کام کرتے رہے۔ یہ بات قابل توجہ ہے کہ اس نیوکلیر سائنس داں نے، غیر شاعرانہ ماحول میں کام کرنے کے باوجود، شعروشاعری اور ادب سے دلچسپی برقرار رکھی۔

Prof. SHARIB RUDAULVI
COLLECTION

امیر کو جذبۂ شاعری نہ صرف فطری طور پر ودیعت ہوا تھا بلکہ ورثہ میں بھی ملا۔ ماں، باپ دونوں اچھے شاعر تھے۔ ان کے زمانہ میں حیدرآباد میں بڑے باکمال شعرا موجود تھے اور شاعری کا بڑا چرچا تھا۔ ہر طرف شعروسخن کے چرچے، علم وادب کی باتیں تھیں۔ جگہ جگہ شعری محفلیں منعقد ہوتی تھیں جن سے شائقین کے ذوق کی تسکین بھی ہوتی تھی اور طالبان فن کی تربیت بھی۔ اس ماحول سے امیر کے ادبی ذوق کو جلا ملی۔

امریکہ کی تیز گام زندگی، گھریلو مصروفیات اور ملازمت سے جو وقت ملتا ہے اسے جعفر امیر اپنی تسکینِ ذوق کے لئے علم، ادب اورفنِ شاعری کی آبیاری میں گزارتے ہیں۔ امریکہ کے مختلف شہروں میں منعقد ہونے والے مقامی اور بین الاقوامی مشاعروں میں مدعو کئے جاتے ہیں۔ جعفر امیر خود اپنے دولت کدہ پر بھی گاہے بگاہے مشاعروں کی نشستیں منعقد کرتے رہتے ہیں۔ وہ اور ان کی بیگم رقیہ امیر اور ان کے بچے،

ایک افتادہ مکاں

کسی گاؤں میں ایک دیکھا مکاں
مکاں تھا یا کوئی کھنڈر کا نشاں

جو لرزاں تھا گوشوں میں سوز و ملال
وہ تقلیبِ دوراں کی تھی ایک مثال

شگافوں سے حجرے تھے سب خستہ حال
سقف سے تھے لٹکے ہوئے کتنے جال

کہیں صحن میں خشت و مٹی کے ڈھیر
تھے بکھرے زمیں پہ نبولی و بیر

اُگے کچھ تھے خود رَو وہاں پیلے پھول
تھے اک ٹوٹے منڈوے پہ کدّو کے پھول

بسی تھی ہواؤں میں پھولوں کی باس
شمیمِ سحر تھی کہیں اُن کے پاس

وہ زینہ کبھی تھا جو در کے قریب
بکھر سا گیا تھا بہ دستِ نہیب

تھے طاقوں میں رکھے جہاں شمع دان
وہاں پر تھے کاجل کے کالے نشان

وہ کونے میں لمبا سا اک تاڑ ہے
احاطے پہ مہندی کی اک باڑ ہے

شکستہ کھنڈر میں تھا بیٹھا ہوا
تباہی کو اس گھر کی دیکھا کیا

کہیں سے یہ آئی مجھے ایک صدا
ازل سے ہی قدرت کی ہے یہ ادا

او، غافل یہ دنیا نہیں پائیدار
تو ہستی پر اپنی نہ کر اعتبار

☆☆☆☆

جنگل میں سہ پہر کا منظر

(واشنگٹن اسٹیٹ، امریکہ کی پہاڑیوں میں)

اختتامِ سہ پہر تھا، ابتدائے وقتِ شام
جُھک گیا تھا آسماں پر شمسِ تاباں سوئے بام

تھی پہاڑوں کی قطاریں بادلوں سے بھی بلند
راستہ تھا پیچ و خم کھاتا ہوا اک بالا بند

آخری ایامِ گرما میں فضا دلگیر تھی
کیفیت یہ دردِ دل کے واسطے اکسیر تھی

تھے پرندے چُپ، فضائے شام میں کھوئے ہوئے
مضمحل سی تھی ہوا، اشجار تھے سوئے ہوئے

تھے صنوبر کے درخت ہر سُو قطار اندر قطار
تھا معطّر دشت، محوِ رقص تھی بادِ بہار

تھی مہک ایسی کہ جسکا عطر دنیا میں نہیں
بستیوں کی بارگاہوں میں گزر جسکا نہیں

یوں تو کہتے ہیں، عبیرِ گل کی ہے مرہوں شمیم
جنگلوں کی خوشبوئیں بھی اُسکی ہوتی ہیں زعیم

جب فضا میں پھیل جاتی ہے شمیمِ برگ و گل
موہ لیتی ہے اثر سے اپنے سب پھولوں کا دل

کنجِ عزلت دور بستی سے بشر پا جائے ہے
وحشتِ ہنگامِ دنیا کو سکوں آجائے ہے

چھن کے پیڑوں سے شعاعیں گر رہیں تھیں فرش پر
اک سنہری دھوپ جو پھیلی ہوئی تھی عرش پر

ننھے سونے کے زمیں پر ہر طرف بکھرے ہوئے
دھوپ کے چھنکاو سے پتے بھی تھے نکھرے ہوئے

گہری چھاؤں سے اندھیرا تھا گھنے پتوں کے بیچ
اور نیلی پیلی کرنیں، منتشر سایوں کے بیچ

جس طرح اُسکی نظر کا نیم کش ہو تارِ نور
میری آنکھوں کی سیاہی دھو گیا تھا مثلِ طور

آ رہا تھا لوٹ کے پکنِک سے میں بچوں کے ساتھ
گھر پہنچنا چاہتا تھا، اس سے پہلے ہو کہ رات

کچھ خیالِ نوجوانی آ گیا، یادش بخیر
کتنے ارمانوں سے ہم بھی جاتے تھے کرنے کو سیر

لوٹتے تھے پکنِکوں سے جب تھکے ہارے ہوئے
ہوتے تھے آسودہ خاطر، نیند کے مارے ہوئے

پیچھے گاڑی میں مرے بچے بھی تھے سوئے ہوئے
اس حسیں منظر کی یادیں اپنے دامن میں لئے

کاروانِ نسلِ انساں یونہی آئے، جائے ہے
دو گھڑی کو زندگی کا گلستاں لہرائے ہے

ہاں، مگر یہ وادی و صحرا مہکتے جائیں گے
ہم نہ ہونگے دوسرے لیکن ادھر کو آئیں گے

☆☆☆

قطعہ

فنا سے ڈر نہیں مجھکو، یہ خوف لاحق ھے
اجل کی راہ میں ملتا ھے دشتِ پیری بھی
میں کانپ جاتا ہوں اُس وقت سے کہ جب ہوگی
عصا بہ دست بھی، دنیا کی دست گیری بھی

☆☆☆

آشفتہ گام

نوٹ:۔ یہ نظم ان دو کمسن اور معصوم لڑکیوں کے نام معنون کی جاری ہے جو ۲۹ مئی ۲۰۰۹ء کی شب پولیس/فوجی درندوں کی حیوانی ہوس کا شکار بن گئیں۔ زناکاری کے بعد انہیں مار دیا گیا اور اُنکی لاشیں نہر کے کنارے، جہاں وہ گھاس کاٹنے آئیں تھیں، پھینک دی گئیں۔ ستمبر میں یہ درندے رہا کر دے گئے، ہندستانی انصاف کی ایک مثال۔

ڈھاچی گام، سری نگر (کشمیر) سے تیس کیلومیٹر مشرق میں ہے۔ وہاں مہادیو پہاڑ کے دامن میں ایک نہر پر بنے ہوئے مکان میں یہ نظم جون ۱۱، ۲۰۰۹ میں لکھی گئی تھی۔

وادیٔ کشمیر کی، اطراف پہاڑوں کے حصار
پیچ کھاتی ہوئی سڑکوں پہ درختوں کی قطار
ندیاں شور مچاتی ہوئی، پہلو میں چنار
ناز و انداز سے چلتی ہے یہاں بادِ بہار

ڈھکی ہوئی ہے برف سے جبینِ راسِ جبل
یہیں پہ بادل و کہسار میں ہو جنگ و جدل

مثلِ زینہ ہیں یہاں کھیت پہاڑوں کے قریں
جا بہ جا باغ ثمر کے ہیں، ترائی کی زمیں
ہے بلندی سی بلندی کہ ہیں بادل بھی مکیں
دیدِ جنت کی تمنا ہو تو آجاؤ یہیں

حسنِ قدرت سے درخشاں ہے سماوی منظر
چاہو گر روح کی تحویر تو، وہ دیکھو اُدھر

دیکھو، وادی میں ہیں بکھرے ہوئے بستی کے نشاں
ٹین کے ڈھالیے مٹی کے ہیں بوسیدہ مکاں
جو ڈھلے شام تو مینار سے ہوتی ہے اذاں
اہلِ دہقاں کا یہی گھر ہے یہی دارالاماں

کھیتی باڑی میں یہاں سب کی بسر ہوتی ہے
جوں توں ہوتی ہے مگر پھر بھی گزر ہوتی ہے

لیکن اس تحفہء قدرت کے نگہبان نہ ہوئے
جو عنا گیر ہوئے، جادہ شناساں نہ ہوئے
ہیں مسلمان مگر صاحبِ ایماں نہ ہوئے
ہونا جن کو تھا پشیماں وہ پشیماں نہ ہوئے

پندِ اقبال[1] کا ہم پر نہ ہوا کوئی اثر
اس لیئے قہرِ الٰہی ہوا نازل ہم پر

کارِ ذاتی سے شرمسار یہاں کارِ اُمم
پولیٹک سے ہے حکومت کی نظامت برہم
داد و فریاد سے کچھ کم نہ ہوا جور و ستم
خلدِ ثانی[2] میں لرزتا ہے بھلا کس کا علم

عصمت ریزی کا ادھر گرم ہے بازار امیرؔ
گریا کیجئے تو نکلتی ہے عدو کی شمشیر

☆☆☆

---

(۱) اقبال کی کشمیر پر ایک نظم کے حوالے سے۔
(۲) خلد ثانی سے مراد کشمیر۔

نظمیات:

خود بینی

کُہن سے رشتہ ہر اک اپنا توڑ آیا ہوں
بہت ہی دُور میں دنیا کو چھوڑ آیا ہوں
فلک پہ فکر کی میں نے کمند پھینکی ہے
میں کائنات سے اک رشتہ جوڑ آیا ہوں

طالب، ہُما اور صنوبر، شعرا اور دیگر مہمانوں کی خاطر و مدارات کا خاص اہتمام کرتے ہیں۔ جعفر امیرؔ مشاعروں میں ترنم سے بھی پڑھتے ہیں اور تحت اللفظ سے بھی۔ یہ ان کے موڈ پر منحصر ہے۔

ان کی شاعری کا پہلا مجموعہ ''عُود کے بادل'' ۱۹۸۷ء میں شائع ہو کر منزل عام پر آیا جسے ادبی حلقوں میں سراہا گیا اور دادِ تحسین کا مستحق ٹھہرا۔ ان کی انگریزی نظموں کا مجموعہ The Distant Song بھی شائع ہو چکا ہے اور امریکہ کی ادبی اور شعری انجمنوں میں نہ صرف پسند کیا گیا بلکہ کئی انعامات بھی حاصل کر چکا ہے۔ یہ بات قابل غور ہے کہ ان کے اجتہاد، فکر اور اندازِ بیان پر انگریزی ادب کا اثر پایا جاتا ہے اور اس کی جھلکیاں ان کی شاعری میں بھی نمایاں ہیں۔

جعفر امیرؔ نے شاعری کا آغاز غزل گوئی سے کیا لیکن انہوں نے مختلف اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ ان کے کلام میں پختگی، اثر آفرینی، سلاست اور صفائی کی خوبیاں پائی جاتی ہیں، جو غزل کی روایات کی آئینہ دار ہیں۔ ان کی تمام شاعری، احساسات، خیالات، الفاظ اور محاورات کا حسین گلدستہ ہے جس میں روایتی قدروں کے ساتھ جدید رجحانات فکر کی آمیزش اور تغزل کی شان پوری توانائی کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ ان کے یہاں جذبات کی پاکیزگی، معنی آفرینی، نزاکت تخیل، روانی و برجستگی،

عطف

بامِ مغرب پہ جو ڈھلتا ہوا سورج دیکھا
یا بہاروں پہ گراں بار، خزاؤں کا زوال
یا جو گزرا ہوں کسی تُربتِ نسیاں سے کبھی
بُود و نابُود کا اُس دم مجھے آیا ہے خیال

سوچتا ہوں کہ مرا کب سے سفر جاری ہے
کہیں رک جائے مبادا نہ میری حرکتِ دل
ہے گجر شام کی تمہیدِ شبِ تار مدام
حوصلہ جس کا، جہاں تک، وہی اُس کی منزل

نہ سخن ساز ہوا اور نہ نگارندہ میں
میری دنیائے ادب سُوکھی سی نیزار رہی
نہ مُطہّر ہوئی انشاء، نہ مرا ذوقِ ہُنر
جو اُپج تھی مرے دل میں نہ وہ بیدار ہوئی

کتنے احساس تھے میں جن کو زباں دے نہ سکا
حُسنِ الفاظ کے رنگوں سے بہا نقشِ جمیل
کتنے افسانے خیالوں میں مچلتے ہی رہے
کتنے جذبے، نہ رقم کر سکا جنکی تفصیل

تھا نہ تکمیلِ عمل اور نہ تخلیقِ حیات
کاسۂ زیست رہا نقدِ ہنر سے خالی
فکرِ آرائش و آسائش و ثروت کے لئے
نہ رہا دل بھی مرا دردِ جگر سے خالی

کوئی تو ہوتی مرے نام سے منسوب کتاب
جو کہ ایوانِ ادب کی کہیں رونق ہوتی
میرے خامہ کی نوشتہ ہی کہانی کوئی
ہر بشر کے لئے گویا سخنِ حق ہوتی

ہاں کبھی نقشِ مُجسم کا بیاں میں کرتا
اُسکا وہ پیار، فقط وجہہ نگارش بھی تو تھا
ایک مدہوش سا وہ حُسنِ ملاحت اُسکا
شانِ تصنیف، تصوف کی سفارش بھی تو تھا

اور یہ حُسنِ مناظر، یہ زمیں، شمس و قمر
بہتے دریا، یہ سمندر، یہ پہاڑوں کا اُبھار
پہلی برسات کی سُوندھی سی وہ مٹی کی مہک
چاہتا تھا کہ کروں نظم، بہاروں کا نکھار

جُھٹپٹا شام کا ہے، نیم اندھیرا چھایا
عطفِ شب میں نہاں ہوگیا، منزل کا ثبات
ایسی منزل کہ رہا جس کا تصور ہی مجھے
جس کی جانب نہ بڑھا تھا کبھی میں حینِ حیات

کچھ تو قسمت کا تھا، کچھ اپنی بھی کمزوری تھی
زندگی کشمکشِ دہر میں یوں ہی گزری
اپنے درپیش مسائل کی پریشانی میں
تھی جو دو دن کی جوانی، وہ جوانی گزری

بام مغرب پہ جو ڈھلتا ہوا سورج دیکھا

☆☆☆

قطعہ

حیراں تھا، جو بسے ہیں میری روح و جان میں
اُس کو بُھلا کے دردِ جگر کیسے کم کریں
دیکھا جو میرا حال تو یہ وقت نے کہا
حضرت یہ کام میری قیادت میں چھوڑ دیں

☆☆☆

ایک تمنا

جہاں کہ دل کو میرے کچھ سکوں نہیں ملتا
جہاں کہ ضربِ کلامِ گراں ہو میرے لئے
جہاں کہ آگ سی لگ جائے ذکرِ ماضی سے
جہاں کہ دَرد کے طوفاں رواں ہوں میرے لئے

ربع صدی یہ وہیں میں نے یوں گزاری ہے
وہیں حیات کی بازی بھی میں نے ہاری ہے

مرے خُلوصِ محبت نے بس یہ چاہا تھا
شگفتہ دیکھوں ہنسی کو لبوں پہ میں تیرے
اگر یہ گردشِ دوراں ذرا جو فرصت دے
یہی تو چاہا تھا دو دن سکوں کے ہوں میرے

کیا گناہِ محبت تو یہ سزا پائی
کبھی ہنسا تو مرے دل سے آہِ سرد آئی

مجھے نہ خواہشِ ثروت نہ فکرِ نام و نمود
متاع و مال کی نہ تھی کبھی طلب مجھ کو
گِلہ کیا نہ کبھی قسمت و زمانے کا
اگر جو چاہا تھا میں نے کبھی تو وہ تجھ کو

رفیقِ جاں کوئی ملتا تو ہم نوا ملتا
گرے جو شاخ سے لالہ تو پھر نہیں کھلتا

☆☆☆☆

قطعہ

آساں نہیں ہے علم کی تحصیل اے امیرؔ
حق کی تلاش ہو تو بصیرت بھی چاہیے
فن کے لئے ہے طبع کی موزونیت ضرور
محنت کے ساتھ ساتھ مہارت بھی چاہیے

☆☆☆☆

عذرِ لنگ

کر نگارش، کہ تری عمرِ رواں جاتی ہے
ذوقِ تخلیق نے جھنجھلا کے کہا یہ مجھ سے
فکرِ روزی و مشیّت سے ذرا آگے بڑھ
قطرۂ آبِ لسانی کو نگینہ کر دے

میں نے اُس سے یہ کہا، کیوں کوئی تصنیف کروں
میں، عرق ریزی کروں کس کی ستائش کے لئے
کشتیِ عمر کی کیا بحرِ ہنر میں ہے بساط
زندگی چاہیے اک فن کی نمائش کے لئے

اب تو ویسے بھی کہاں، عمر مری ہے باقی
آنکھ جھپکی تو بہاروں کا زمانہ گزرا
جو بھی قسمت میں لکھا تھا، وہ ہوا ہے یارو
ہدفِ غم سے میرا نہ نشانہ گزرا

☆☆☆

کسے پتہ ہے

کسے پتہ ہے بھلا راہِ زندگانی میں
سحر ہماری کہاں، دوپہر کہاں ہوگی
ملے گا سایا شجر کا کہاں مسافر کو
ڈھلے گی شام تو اپنی بسر کہاں ہوگی

کوئی نہ جانے یہاں آج، کل کو کیا ہوگا
جو رازِ غیب ہے اسکی خبر کہاں ہوگی
ہر ایک موڑ پہ اُمید دید منزل ہے
اُمید خام مگر معتبر کہاں ہوگی

یقیں حیات کا کیسے ہو جب نہیں معلوم
کہ موت آئے گی اپنی، تو کب، کہاں ہوگی

تکرارِ دستورِ زماں

وہی دستور زماں ہے، وہی اندازِ حیات
وہی بے کیف سحر ہے، وہی بے خواب سی رات

وہی دُنیا کو سمجھنے کی مسلسل کوشش
وہی اُلجھی ہوئی منطق، وہی اُلجھی ہوئی بات

وہی تکرارِ شب و روز، وہی منصب کار
یکنواختی سے ہے بیزار سی کچھ اپنی ذات

چھوڑ کے تو جو گیا، کھو سا گیا ہوں جیسے
تو جو آجائے تو مل جائے مجھے راہ نجات

☆☆☆

بدلتی صورتیں

شرر کبھی ہوں، کبھی اک پھوارِ مستانہ
بنا ہوں شمع کبھی اور کبھی ہوں پروانہ

کبھی ہوں ماہِ فلک اور کبھی ہوں گردِ زمیں
کبھی ہوں عاقل و دانا، کبھی میں دیوانہ

کبھی ہوں گونج، گرج اور کبھی ہوں بانگِ درا
کبھی ہوں گنگ، کبھی اک سکوتِ ویرانہ

کبھی ہوں آبِ رواں اور کبھی ہوں بادِ سحر
کبھی جبل ہوں کبھی اک جمودِ تبہ خانہ

بدلتی رہتی ہیں انساں کی صورتیں کیا کیا
بنایا جس نے مجھے، ہوں اُسی کا افسانہ

زبان و بیان کی دلکشی اور تشبیہات و استعارات کے حُسنِ استعمال کی خوبیاں بھی بدرجہ اتم موجود ہیں۔ مندرجہ ذیل اشعار ان خوبیوں کی وضاحت کرتے ہیں:۔

سیکھا چمن میں برگ سے، شبنم سے، پھول سے
درسِ حیات اُن سے لیے جا رہے ہیں ہم

☆☆☆

سیکھا ہے گُل نے مجھ سے سلیقہ نکھار کا
میری نظر سے دیکھ تماشا بہار کا

☆☆☆

ذلتیں عمر اسیری کی جو سہہ لیں میں نے
موت نے آکے کہا، جا تجھے آزاد کیا

☆☆☆

شبِ حیات کی محرومیوں پہ کیا روتا
وہ چارہ گر مرا ہوتا، اگر خدا ہوتا

☆☆☆

انکار کب تھا، پاس تھا اک اپنی رسم کا
وہ کہہ سکے نہ میری کسی التجا پہ 'ہاں'

☆☆☆

مُنہ موڑ کے وہ جاتے ہوئے مجھ سے کہہ گئے
سُنتے ہیں، یہ ہی آخری منزل ہے عشق کی

شہرت کی خواہش

نوٹ:۔ دہلی کے ائرپورٹ پر خط کی صورت میں یہ نظم لکھی گئی تھی۔ کتاب کی اشاعت کے سلسلے میں میں دہلی سے دکن جارہا تھا۔

آساں نہیں ہے، قوّتِ اقدام چاہیے
آگے بڑھو کہ ہمت دو گام چاہیے

شائع میں کر کے آیا ہوں اپنی جو یہ کتاب
میں سوچتا ہوں، کیوں یہ مجھے کام چاہیے

جانا ہے پھر دکن کو، کراچی کی قید بھی
اک دردِ سر ہے، کیوں یہ مجھے نام چاہیے

اب تھک گیا صُعُوبتِ خود ساختہ سے میں
اِس ابتدا کو منزلِ انجام چاہیے

آتی ہے مجھ کو شام و سحر یاد آپ کی
کہتا ہے دل کہ پہلوئے گلفام چاہیے

ہمت کہاں تھی، اذنِ سفر غیب ہی سے تھا
خواہش تھی کب کہ شہرت و انعام چاہیے

☆☆☆

قطعہ

توڑتے ہیں پیار کے رشتے ذرا سی بات پر
دورِ حاضر میں وہ پہلی سی رواداری کہاں
دوستکانی ہو گئی ہے طرزِ یارانی امیرؔ
دوستکانی ہے کہاں، اب وہ وفاداری کہاں

پھولوں کی زبان

'مہک' زبان ہے پھولوں کی، سُن رہے ہو امیرؔ
بڑے ہی پیار سے تم کو خطاب کرتے ہیں
ہر ایک جنس کا انداز گفتگو ہے الگ
وہ بادِ حُسنِ بیاں کو گلاب کرتے ہیں

ترے ہی پاس نہیں ہے بیان و فکر و خیال
گلوں کی شوخ کلامی کا دیکھ تو بھی کمال

☆☆☆

قطعہ

ملامت کر نہ تو ناکامیوں پر اپنی اے ناداں
یہی وہ تجربے ہیں جن سے پاتے کامرانی ہیں
بھٹکنا کاوشِ منزل میں اکثر سب کو پڑتا ہے
عمل کی حکمتوں میں تجرباتِ زندگانی ہیں

☆☆☆

ماحول کا اثر

مثالِ طفلِ غزالاں اگر جو ہوتا میں
اُچھلتا، کودتا پھرتا میں مرغزاروں میں

فضائے پاک میں، معصومیوں کے سائے میں
بدی سے دُور جو رہتا، تو لالہ زاروں میں

اگر جو پوچھتا یارب تو بالیقیں کہتا
رقم ہو نام مرا تیرے نیکو کاروں میں

مگر برائی کی دنیا میں نیک رہ نہ سکا
شریک ہوگیا میں تیرے گناہ گاروں میں

تو جانتا ہے حقیقت، ہو تجھ سے پردا کیا
جواز و عذرِ عبث، حق کی رہگذاروں میں

سکونِ تنہائی

گنجِ تنہائی میں ہم ایسے پریشاں بھی نہیں
کوئی محرومیٔ ہنگامۂ یاراں بھی نہیں

تیرے جانے سے اکیلا تو ہوا ہوں لیکن
تیرے جانے سے مرا دَرد فروزاں بھی نہیں

تُو نے چھوڑا، تو زمانے سے بھی رشتہ ٹوٹا
عشق کا غم ہے کوئی، اب غمِ دوراں بھی نہیں

دل کو سمجھاتا ہوں، کرتے ہو شکایت کس سے
مہرباں ہوگا کوئی، اس کا اب امکاں بھی نہیں

گھر کی خاموش فضاؤں میں اُداسی ہے مگر
اِس اُداسی میں کوئی وحشتِ ویراں بھی نہیں

تُو جو آیا میری دنیا میں تلاطم آیا
تُو نہیں ہے تو مرا چاک گریباں بھی نہیں

کیسی تکرار ہے، محبت ہے، شکایت کیسی
اس کہانی میں کوئی زود پشیماں بھی نہیں

باعثِ درد ہوئی قربتِ یاراں اکثر
اب مجھے آرزوئے صحبتِ جاناں بھی نہیں

پھر سے کرنا ہے سفر مجھکو نئی راہوں پر
نئی منزل کے لئے راہِ گلستاں بھی نہیں

تیرے ہی دامِ محبت میں گرفتار رہا
محفلِ غیر میں، اُمید مہرباں بھی نہیں

تجربوں نے یہ سکھایا ہے کہ بستی میں امیرؔ
مرہمِ زخم نہیں، درد کا درماں بھی نہیں

تلاشِ جہانِ ناپید

جہاں نہ سایۂ ماضی کہیں نظر آئے
جہاں نہ فکر ہو فردا کی کوئی دامن گیر
نہ دوست ہو نہ شناسا نہ کوئی دشمن ہو
کسی کی عنبری زُلفوں کا میں نہیں ہوں اسیر

سفر جو ہو، تو کوئی کارواں نہ رہبر ہو
نہ منزلوں کے لیئے ہو تلاش دامن گیر
ہو دشت میرا مکاں اور کوہ دیواریں
ہو سائباں کی طرح سر پہ آسمانِ دبیر

نہ یوں حیات ہو فکرِ معاش سے بیزار
کہ جیسے پاؤں میں ہوتی ہے قید کی زنجیر
نہ بدظنی کی ہو کُلفت نہ ڈر سزا کا ہو
نہ التجائے کرم سے کروں میں خود کو حقیر

اگر میں سیکھ لوں قدرت سے زندگی کا چلن
یہ برگ، پھول، ہوا، بس یہی ہوں میرے مشیر
کبھی جو نیند نہ آئے دراز راتوں میں
فلک کے راز سنائیں مجھے، فلک کے سفیر

نہ خواب آئیں، میری نیند اتنی گہری ہو
سحر کو حاجتِ تفسیرِ خواب ہو نہ امیرؔ

☆☆☆

قطعہ

تیار بادبان تھا، چلتی تھی بادِ شُرط
شوقِ سفر تھا، شوقِ سیاحت بھی تھا مجھے
آواز دے رہے تھے جزیرے بھی دور سے
لیکن بڑھے نہ چھوڑ کے ساحل کو ہم ترے

☆☆☆

بنجارا حالی

نوٹ:۔

نوکری کے سلسلے میں فلٹن (Missouri) میں میرا قیام دو سال کیلئے رہا۔ اس دوران میں اپنی تمام ضروریات بشمول کھانے پکانے کے مجھکو پوری کرنی پڑتی تھیں۔اپنی بنجارہ حالی کا ذکر اس نظم میں کیا ہے۔

خود پکا لیتا ہوں، کھا لیتا ہوں
پیٹ کی آگ بُجھا لیتا ہوں

ملا کے تیل اور نمک، پانی
کچھ نہ کچھ روز پکا لیتا ہوں

غصّہ آتا کبھی جو ہے مجھ کو
ہونٹ دانتوں سے چبا لیتا ہوں

پیاس میں زہر ہو کہ آبِ ناب
جو ملے منہ سے لگا لیتا ہوں

جاری رہتی ہے جو راحت کی تلاش
ہر غمِ زیست اُٹھا لیتا ہوں

وقت سے ہاتھ ملا کر میں امیرؔ
وقت کو اپنا بنا لیتا ہوں

☆☆☆

قطعہ

ستم ظریفیٔ کاتب کہ ایک اک کر کے
کتابِ ہستی کے اوراق کو اُلٹتا ہے
امیدِ فردا میں جیتے ہیں لوگ مر مر کے
اسی اُمید پہ ہستی کا کام چلتا ہے

اُکھڑے اُکھڑے بڑے دُور سے کرتے ہیں سلام
مسکراہٹ ہے، نہ عشوہ ہے، نہ غصہ، نہ کلام

امیؔر نے غزل کے روایتی مزاج اور اسلوب کو برقرار رکھا ہے۔ ان کی سادگی اور پرکاری کی بھی چند مثالیں ملاحظ فرمایئے:۔

دریوزہ گرِ جلوۂ جانانہ بنا ہوں
تُو شمع بنی، میں ترا پروانہ بنا ہوں

☆☆☆☆

بجھتا بجھتا ہوا ایسے یہ دیا جلتا ہے
نہ اُجالے نہ اندھیرے کا پتہ چلتا ہے

☆☆☆☆

نازاں تُو اپنے حُسن پہ، حسنِ نظر پہ میں
اک شانِ امتیاز بھی ذوقِ نظر کو ہے

☆☆☆☆

ناوک پہ اپنی، حُسن کو بیجا غرور ہے
اک حوصلہ بھی صبر کا میرے جگر کو ہے

☆☆☆☆

ادائے حُسن کا دیوانہ گو ہمیشہ رہا
مزاجِ حُسن کو سمجھا نہ یہ زمانہ کبھی

اختتامِ سفر

لو لگا دی سرِ ساحل میری کشتی میں نے
ختم آخر کو کیا، گردشِ ہستی میں نے

کوئی آواز نہ آہٹ ہے، بجز موجوں کی
ایسی سنسان سی دیکھی نہیں بستی میں نے

بادل آتے ہیں، گرجتے ہیں گزر جاتے ہیں
پہلے دیکھیں تھیں گھٹائیں بھی برستی میں نے

رُخ ہواؤں کا بھلا کون بدل سکتا ہے
لے گئی موج جہاں، ناؤ لگا دی میں نے

شام ڈھلنے کو ہے دریا بھی گہر بار ہوا
رات دیکھی ہے ستاروں سے سنورتی میں نے

آسمانوں میں ستاروں کی ہے آوازِ سفر
سرسراہٹ سی سُنی دُور سے آتی میں نے

منجمد موت ہے، ہستی ہے تغیّر پرور
دنیا دیکھی ہے کئی بار بدلتی میں نے

رات میں پھول جو کھلتے ہیں تو وہ کس کے لئے
رات میں بُلبلیں دیکھیں نہ چہکتی میں نے

☆☆☆☆

قطعہ

ایک جھینپی سی ہنسی اور ہچکچاتا سلام
ایک تمہید تعارف کی جھجکتی کوشش
خواہشِ دید میں اُٹھتی تھیں بہکتی آنکھیں
تھی رگِ جاں میں اُمنڈتی ہوئی خوں کی یورش

☆☆☆☆

گناہِ لاشعور

کلام غیر کو منسوب اپنے نام کروں!
سُبک ہوں جس سے، بھلا ایسا کوئی کام کروں!

نہیں ہوں دانا، وَلے بزمِ رندگانہ میں
ایاغ غیر ؛ لے کر میں نوشِ جام کروں

یہ کیسی بھول ہوئی مجھ سے لاشعوری میں
قدم قدم پہ جو میں فکرِ اعتصام کروں

نہیں ثبوت کوئی جبکہ بے گناہی کا
تو اِستناد کا کیا خاک انتظام کروں

دروغ گوئی کی تہمت نہ دے مجھے ظالم
تو بدگمان ہے، میں کیسے تجھ کو رام کروں

ادب کی راہ میں، اَسپِ قلم جو دے پرواز
سفر میں وُسعتِ کونین ایک گام کروں

خیال ہو نہ سکے جو کبھی گرفتِ نظر
اُسی خیال کو میں حاصلِ کلام کروں

بہار کا ہو بیاں یا خزاں کے رنگوں کا
ہر ایک رنگِ تغیر بہر مقام کروں

جو کھینچوں منظر قدرت تو آئینہ کردوں
ہو بات پھول کی، بلبل کو لاکلام کروں

پہنچ مرے یدِ طولیٰ کی ہے بلند رسا
مجھے نہیں ہے ضرورت جو تشنہ کام کروں

لساں خروش ہوں اپنا کے اُس کا حرفِ سخن!
جسے میں شوقِ عقیدت میں صد سلام کروں

امیرؔ اُنکا تصرّف بجا سہی لیکن
نہ ہوگا کچھ بھی اثر ذکر اختتام کروں

☆☆☆

قطعہ

کام ہے صحرا نوردی، ہے تغیّر میرا نام
جو سفر میں ہے مزا، منزل کے پانے میں نہیں
روحِ بنجارہ کو کیسے آپ سمجھیں گے امیرؔ
زندگی کا لُطف کوئی ٹہر جانے میں نہیں

☆☆☆

شکایتِ بے ادبی

نہیں واقف ہے جو آدابِ خیلِ رِندِ گانہ سے
گرہ میں باندھتا اُس کا بھلا کیا بے ادب ہونا

ادائے بے حسی سے ٹوٹ جاتا ہے خلوصِ دل
گھٹا چھائی تو، میں نے دن کو دیکھا، دن کا شب ہونا

اگر تھی خواہشِ محفل تو ایسی بھی نہیں اپنی
اگر ہوں رنجشیں باہم تو بیجا ہے طلب ہونا

خیالِ دوستی تھا، پر تضرّر میں نہ سہہ پایا
وگرنہ تھا بڑا مشکل شکایت کا بلب ہونا

ثبوت عظمت شعر و سخن تھا بے اثر اُس پر
یہی دیکھا یہاں ہم نے، سبب کا بے سبب ہونا

لکھا قسمت کا کیا جانے بشریاں وقت سے پہلے
کسے معلوم ہوتا ہے، یہاں ہونے کا کب ہونا

بکھر کے خاک میں، نکلوں گا پھر سے، برگ وگُل ہوکر
فنا ہے وہ عمل، ہوتا ہے جس میں اک کا سب ہونا

ڈھلی ہے شام گردوں پر، شب تاریک آتی ہے
ابھی تو ہوں، ابھی باقی ہے میرا مُقتضِب ہونا

زُباں سے جو نہ کہہ پایا، لکھا اُن کو ہے شعروں میں
شکایت کو بھی ہوتا ہے، کبھی جانِ ادب ہونا

یقیں تدبیر پر کیسے کروں، قسمت بھی حائل ہے
کسے معلوم ہوتا ہے یہاں ہونے کا کب ہونا

امیرؔ، اب ڈھونڈیو، اک گُنجِ عُزلت دُور دنیا سے
بہاروں سے چمن کو ہے مہذب، با ادب ہونا

☆☆☆

صدرِ مشاعرہ سے خطاب

کبھی محجوب، کبھی زود پشیماں ہوں گے
تیری محفل میں گھڑی بھر کے جو مہماں ہوں گے

رسمِ آدابِ کُہن قصۂ پارینہ ہوئے
نئے آداب زمانے میں نمایاں ہوں گے

شاخِ کج رو سے تراشیں گے کہاں دستِ قلم
گل کی صورت میں کہاں خارِ مُغیلاں ہوں گے

تری محفل میں مجھے کیوں تھا غزل خواں ہونا
یہی سوچا تھا یہاں اپنے زباں داں ہوں گے

الاماں! دیکھ ذرا شان و تکبر اُن کا
تیری غزلوں پہ جو کب سر نہ ثنا خواں ہوں گے

جس کو معلوم نہیں جادہ و منزل کا پتہ
وہی سالار، وہی رہبرِ ذیشاں ہوں گے

مرحبا! آپ کا وہ صبر و تحمل اے دوست
دیکھ ایوب بھی انگشت بہ دنداں ہوں گے

مومنِ دینِ ادب میرے ثنا خواں ہوں گے
اللہ اللہ ہی کریں گے جو مسلماں ہوں گے

نکتہ چینی کے بھی ہوتے ہیں رسوم و آداب
یاوہ گو! لوگ تیرے طنز سے نالاں ہوں گے

کچھ تو فانوس محبت کے چراغاں کر دے
ورنہ تاریک ترے دل کے یہ ایواں ہوں گے

بزمِ احباب میں تھا مجھ کو ہی رُسوا کرنا
شومئی وقت! ترے اور بھی مہماں ہوں گے

سر جُھکائے ہوئے خاموش سے بیٹھے ہیں امیرؔ
شورِ محفل میں، اکیلے نہ پریشاں ہوں گے!

☆☆☆

جواب دینے میں تاخیر

جواب دینے میں نامے کے ہو گئی تاخیر
خیال آپکا ویسے تو بار بار آیا

رہینِ کارِ جہاں گو رہا ہوں میں اکثر
بُھلا دوں دوست کو ایسا نہ اِنتشار آیا

کیا جو ترکِ ادب، رسمِ خط نویسی میں
خطا کی پُشت پناہی پہ عذرِ کار آیا

بتاؤں کیسے مرے دل میں جو تقدّس ہے
ترے خیال سے ہر شعر میں نکھار آیا

یقین آپ کی باتوں پہ مجھ کو آتا ہے
وگرنہ جنسِ بشر پر نہ اعتبار آیا

چاند نکلا تو اس کی یاد آئی
بڑھ گئی اور میری تنہائی

☆☆☆

رقص کرتا ہوا جب شعر قلم سے اُترا
میں یہ سمجھا کہ مجھے دولتِ کونین ملی

امیؔر بنیادی طور پر تو غزل کے شاعر ہیں لیکن انہوں نے غزل کی حد بندی توڑ کر نظم کی اُن وسعتوں میں نکل آئے جہاں مضمون آفرینی محدود نہیں۔ جعفر امیؔر کو قدرتی حُسن سے اک والہانہ محبّت ہے۔ ان کا زیادہ تر کلام حُسنِ قدرت کے بیان میں ملتا ہے۔ موسموں کی تبدیلیوں، قدرتی مناظر، دریاؤں کا بہاو، وادیوں کا حُسن، پہاڑوں کی بلندیاں، دشت کی تنہائیاں گُل وگلستان کی تصویر جگہ جگہ ان کے کلام میں ملتی ہیں۔ اور ساتھ ہی قدرت کے حُسن سے پیدا ہونے والے احساسات، تاثرات اور مشاہدات کا ذکر شاعری کی بھرپور طاقتوں کے ساتھ الفاظ کی نئی بندشوں میں رونما ہوتا ہے۔ قدرتی حُسن پر امیؔر نے، آجکل کے تمام شعراء سے زیادہ لکھا ہے۔ پرانے شعراء میں اس قسم کا کلام مولانا حالؔی، میر انیؔس اور جوشؔ کی شاعری میں ملتا ہے۔ نئے مضامین کو منظوم کرنا ان کی شاعری کی انفرادی خصوصیت ہے۔

بقول چکبست: عروس فکر کو ہم قید سے آزاد کرتے ہیں
نئے مضمون، نیا رنگِ سخن ایجاد کرتے ہیں

ملا ہے حُسنِ سخن آپکی محبّت سے
پڑھا جو اپنا لکھا، مجھکو انکسار آیا

میں آکے مِل نہ سکا، دُوریٔ مکاں کے سبب
جو یاد آپ کی آئی تو دل فِگار آیا

☆☆☆

قطعہ

دوپٹہ سر سے ڈھلتا جا رہا ہے
نظر کا شوق بڑھتا جا رہا ہے
گلے ملتی ہے طِفلی سے جوانی
جُنونِ عشق چڑھتا جا رہا ہے

☆☆☆

تلاشِ ذوقِ نظر

ہوئی نہ قدر سخن کی تو کوئی بات نہیں
کہ صبحِ فکرِ رسا کی جہاں میں رات نہیں

کلام اپنا نہ شائع ہوا تو کیا غم ہے
زبانِ اُردو کا بازار بھی تو مدھم ہے

ادب کا آج وہ معیار برقرار نہیں
شعور و شوق پہ دنیا کے اختیار نہیں

مرے کلام کا کوئی ملا نہ شیدائی
فنِ لطیف کی ہوتی نہیں پذیرائی

فلک سے جیسے مرے دل میں روشنی اُتری
کہا قلم نے نگارش سے چاندنی اُتری

کہانی میں نے ازل تا ابد کی لکھ ڈالی
ادب کی شاخ پہ جیسے ہو پھول کی بالی

عجب نہیں کہ جو بدلے روش زمانے کی
چلے گی بات ادب میں مرے فسانے کی

جو ذوق بدلے گا دیوانہ وار چاہیں گے
مرے کلام کو آنکھوں سے بھی لگائیں گے

☆☆☆

قطعہ

دن گزرا ہے ناداری میں
کروٹ کروٹ رات کٹی
عشق کا کیسا روگ لگایا
ہستی ساری یوں ہی مٹی

☆☆☆

نظمیات:

ذکرِ اقربا

رفیق، کوئی بھی ماں کے سوا نہیں ہوتا
شفیق، کوئی یہاں باپ سا نہیں ہوتا
کوئی کسی کا یہاں ہم نوا نہیں ہوتا
کُجا زمین، فلک آسرا نہیں ہوتا

بیٹی کے جانے پر

تمہیں میں کیسے بتاؤں کہ اے میری بیٹی
تمہارے غم میں یہاں کیسے میں سُلگتا ہوں
تمہاری فکر جلاتی ہے کس طرح مجھ کو
تمہاری یاد میں، میں کسطرح تڑپتا ہوں

خوشی اگر کہیں ملتی، سمیٹ لاتا میں
تمہاری راہ میں پھولوں کو میں بچھا دیتا
تمہارے دل میں بسے خوف ہائے فردا کو
مٹا کے رنگِ یقین ظفر سجا دیتا

اُداس چہرے کو دیتا گلوں کی شادابی
بجھی سی آنکھوں میں تاروں کی روشنی بھرتا
صحت کو رنگِ بہاراں کا جوہرِ دائم
میں ذہن و دل کو تدبر سے آہنی کرتا

مگر میں کر نہ سکا وہ جو میں نے چاہا تھا
چلی گئی ہو مجھے چھوڑ کر اکیلا اب
یہ تھی مشیتِ قدرت یہی تھا قسمت میں
خدا کی باتوں کا سمجھا کہاں کوئی مطلب

مگر یہ باپ کی اُلفت کبھی نہ تم بھولو
دُعا ہے میری جہاں بھی رہو، پَھلو، پھُولو

☆☆☆

قطعہ

بدل سکتے ہو گر حالات کو، حالات کو بدلو
اگر ممکن نہیں تو پھر نیا اک راستہ ڈھونڈو
سکونِ دل اگر اس زندگی میں تم کو پانا ہے
تو اپنی استطاعت، مُشکل حالات کو سمجھو

☆☆☆

بیٹی کا دل دکھانے پر

اپنے ننھے ہاتھ پر رُخسار کو رکھے ہوئے
خم کئے گردن کو اپنی، اک طرف کروٹ لیے

میری بیٹی سو رہی تھی، سِن تھا کوئی سات سال
دامنِ مادر میں جیسے گُل کِھلا تھا نونہال

کمسنی کے سِن پہ تھیں بکھری ہوئی معصومیاں
تھی عیاں چہرے پر گہری نیند کی خاموشیاں

کھیلنے سے تھی تھکن دن بھر کی، ننھی جان پر
ہونٹ تھے سُوکھے ہوئے اور تھی نمی مِژگان پر

میری باتوں سے خفا ہو کے ابھی وہ سوئی تھی
میں نے ڈانٹا تھا کسی حرکت پہ تو وہ روئی تھی

اُس کے پہلو میں کھڑا میں دیر تک دیکھا کیا
شال کو اوپر اُڑھایا، زیرِ سر تکیہ کیا

تھا عجب قلبِ پدر میں جذبۂ اُلفت رواں
اک عجب احساس جس کو کر نہیں سکتے بیاں

کیوں ہوا ناراض اُس پر تھی پشیمانی مجھے
ہاں مگر جھنجلا گئی تھی اُس کی نادانی مجھے

دیکھ کر معصوم چہرہ ہوگیا میں پُر ملال
اور مجھے آنے لگا اس سخت گیری کا خیال

اس طرح تعلیم دینا دین میں شامل نہیں
یہ بھی سوچا اس جہاں میں کوئی بھی کامل نہیں

ماں کی یاد

ہائے تیری وہ محبت، ہائے وہ ایثارِ جاں
ہو گئے خاطر نشاں، اے ماں ترے جانے کے بعد

عمرِ پیری میں ادھر کچھ یادِ رفتہ اور ہے
دل نہیں لگتا یہاں، اے ماں ترے جانے کے بعد

کیوں تری آواز آتی ہے شبِ خاموش میں
خواب میں تیرے نشاں، اے ماں ترے جانے کے بعد

پھول کھلتے ہیں ابھی تک، آم میں آتا ہے بور
ہے اُداسی آویزاں، اے ماں ترے جانے کے بعد

تیری تُربت مٹ گئی روؤں کہاں میں جا کے اب
دل بہلتا ہے کہاں، اے ماں ترے جانے کے بعد

کس طرح کاٹی امیرؔ بے وطن نے زندگی
کس سے کہتا داستاں، اے ماں ترے جانے کے بعد

☆☆☆

منہ موڑ کے نہ جاؤ اے ماں

منہ موڑ کے جاتی ہو، سکوں کیسے میں پاؤں
میں کس سے کہوں، دردِ جگر کس کو بتاؤں
ہے یادوں کا طوفان، اُسے کیسے بُھلاؤں
دنیا میں اکیلا ہوں، اکیلا کہاں جاؤں

کیا بات ہے، خاموش ہو، اب کچھ تو بتاؤ
ہاں، کس نے کہا تم سے مجھے چھوڑ کے جاؤ

☆☆☆

شبِ انتقال

(ماں کی بیماری کی خبر سُن کر)

آج کی رات نہ جاؤ، ماں جی
آج کی رات نہ جاؤ
دل یہ ڈوبا جائے ہے، ماں جی
آج کی رات نہ جاؤ

☆☆☆

بہ رنگِ دِگر

سید جعفر امیر رضوی

بقولِ امیرؔ: خیالِ نو کو کرتے ہیں سخن میں ہم گہر کیا کیا
یہی الفاظ کی بندش سے ہوتے ہیں ہنر کیا کیا

امیرؔ نے روایتی نظمیں بھی لکھی ہیں اور آزاد نظمیں بھی لکھی ہیں جو دلفریب ہیں۔ آزاد نظم کے متعلق ان کا خیال ہے کہ یہ صرف ایک صنف ہی نہیں ہے بلکہ ہماری شاعری کے لئے نئی زبان کی تلاش کے مترادف ہے۔ وہ بڑے حسین انداز و الفاظ میں خیالات کو شعری پیکر میں ڈھالتے ہیں۔ ان کی شاعری زمانہ و زندگی پر محیط ہے۔ ان کی نظمیں جدت، شگفتگی، مضمون آفرینی، علمی و فلسفیانہ مضامین اور نئے نئے عنوانات کے لئے قابل قدر ہیں۔ ان میں زبان و بیان پر قدرت، قدامت و جدت کے درمیان توازن اور ایک نئے رنگ و آہنگ کا احساس ملتا ہے۔ ان کی نظمیں بہ عنوان، چاندنی رات میں سمندر کا منظر، قرطبہ کی مسجد، بازگشت، نیند، تمکنت، یادِ طفلی، پلنگ، عطف، برسات، گرما، سرما، خزاں، بہار، پھوار، چودھویں کا چاند اور پیاز وغیرہ انفرادیت مضمون آفرینی اور ندرت خیال کے لئے آپ اپنی مثال ہیں۔

امیرؔ کو زبان و بیان پر قدرت حاصل ہے۔ ان کی حسن اور عشق کی غزلیں اور نظمیں نہ تو زبان اور بیان کے لحاظ سے مختلف ہیں بلکہ بڑی رومانی بھی ہوتی ہیں۔ یعنی حسیاتی قدروں سے لبریز ہیں اور حواس خمسہ پر اثر کرتی ہے۔

ماں کی رِحلت پر

نوٹ :۔ میرے امریکہ آنے کے تین سال بعد میری امّی کا انتقال، طویل بیماری کے بعد ہو گیا۔ اُن کے آخری وقت میں اُن کے قریب نہ تھا جس کی تکلیف مجھے زندگی بھر رہے گی۔

تُو اکیلی تھی میں مصروفِ جہاں تھا، اے ماں
تیری رِحلت پہ میں بد بخت کہاں تھا، اے ماں

کب یہ سوچا تھا کہ میں دیکھ سکوں گا نہ تجھے
ایسا غربت میں لٹوں گا، نہ گُماں تھا، اے ماں

آفتیں مجھ پہ زمانے کی گراں ہو نہ سکیں
جُز ترا روٹھ کے جانا، جو گراں تھا، اے ماں

ایک تنہائی کا احساس رہا تیرے بِدوں
تیرے جانے پہ عبث کارِ جہاں تھا، اے ماں

پا بہ جولاں بھی تھا میں اور مسافت لمبی
مجھکو معلوم نہیں تھا کہ کہاں تھا، اے ماں

ہاں کسی طور سے سنبھلی نہیں حالت دل کی
دلِ مجبوب بھی صد نالہ کناں تھا، اے ماں

میرے احساس شکستہ، میرے جذبے مجروح
چشمِ گریاں میں اندھیرا سا، دُھواں تھا، اے ماں

حسرت و درد کی تصویر رہیں تا بہ حیات
ہاں خدا، قاضی الحاجات کہاں تھا، اے ماں

آہ! میں کر نہ سکا درد کا درماں کوئی
یوں تو ہر درد ترا، مجھ پہ عیاں تھا، اے ماں

اور رو لینا تھا کچھ روز میرے آنے تک
میں جو پردیس میں آلام بجاں تھا، اے ماں

تیری خدمت کا نہ احساس کبھی مجھ کو ہوا
میں تھا بے حس، یہی احساس گراں تھا اے ماں

کتنی یادیں ہیں تیری جو کہ اُبھر آتی ہیں
وہ ترا پیار جو سرمایۂ جاں تھا، اے ماں

☆☆☆

قطعہ

علم وہ چیز ہے جس علم کے ملنے پہ ہمیں
اپنی لاعلمی کا احساس بھی ہو جاتا ہے
حاصلِ فن کے لئے عمر گزاری لیکن
پھر بھی لگتا ہے ہمیں کچھ بھی نہیں آتا ہے

☆☆☆

وقتِ پیری

نوٹ :۔ ابّا کی زندگی کے آخری ایّام سے متاثر ہو کر۔

ہے دل کا کاروبار نہ دنیا سے کام ہے
طُولِ شبِ حیات بھی آخر تمام ہے

ہم جانتے ہیں کون گزرتا ہے بار بار
دستک کا انتظار یہاں صبح و شام ہے

ٹوٹا سرورِ عشق نہ میرا دمِ نزع
آتا ہے اُس کا نام، پھر اللہ کا نام ہے

منہ دیکھتے ہیں پاس سے گزرے جو ہے کوئی
پرسش کوئی کرے نہ کوئی ہم کلام ہے

بازارِ زندگی سے چلے آئے خالی ہاتھ
پیری میں سوچنے کا یہی ایک کام ہے

ہر سُو عجب سکوت ہے چھایا ہوا یہاں
اِک سانسِ آخری کا بڑا اہتمام ہے

تنہائیوں کا درد نہ پوچھے کوئی امیرؔ
یہ دردِ جاں بلب، دمِ ہستی مُدام ہے

☆☆☆

قطعہ

ایک نقطے میں نظر آئی جہاں کی وُسعت
ایک ذرے میں رواں طاقتِ شمسی دیکھی
پھول میں دیکھا عناصر کا بھی حُسنِ ترتیب
وقت میں سرعتِ حرکتِ برقی دیکھی

☆☆☆

پیرانہ سالی

بارِ ماہ و سال سے اب جھک گئی میری کمر
اب نہیں جوشِ جوانی کا میرا وہ کرّ و فر

سوچتا تھا زندگی میں آئے گا نہ انحطاط
تھا تکبّر سر چڑھا، جھکتا نہیں تھا میرا سر

کیا حقیقت ہے مری، اس انقلابِ وقت نے
کر دیئے ہیں آسمان و بحر و بر، زیر و زبر

اپنی حالت دیکھ کر آتا ہے رونا اب مجھے
ہوگیا پیرانہ سالی کا جو صورت پر اثر

اکڑے اکڑے کس لئے پھرتے تھے دنیا میں امیرؔ
دیکھتے ہو کر گئی کیا گردشِ شام و سحر

بسترِ مرگ

نوٹ :۔ والد کی پیرانہ سالی میں اُن کی تنہائی سے متاثر ہو کر

ہونے کو ہے غروب، وہ سورج ہوں شام کا
اِس بزمِ بے ثبات میں زندہ ہوں نام کا

حُسنِ جہاں کو چھوڑ کے، گوشہ نشیں ہوں میں
یعنی سکوتِ مرگ کے بے حد قریں ہوں میں

رنگینیاں حیات کی ماضی میں کھو گئیں
تنہائیاں بھی مونس و غم خوار ہو گئیں

کُرسی کے پہلو میز پہ رکھی ہیں ادویات
کچھ خط پرانے، کاغذ و عینک سرِ لغات

بس رہ گیا ہے اب یہ اثاثہ جہان میں
کیا کچھ کیا تھا جمع یہاں، ہم نے شان میں

اب روز و شب گزرتے ہیں یوں اضطراب میں
"نے ہاتھ باگ پہ ہے نہ پا ہے رکاب میں"

کٹتے نہیں ہیں شام و سحر ماہ و سال اب
دردِ جگر ہے، آنکھ میں رہتا ہے جال اب

اب گُل سے کوئی رشتہ نہ بادِ بہار سے
ہوتی نہیں ہے چھیڑ کبھی چشمِ یار سے

پوچھے نہ غیر، اب نہ کوئی دوست آئے ہے
گزرے کوئی قریب سے منہ پھیر جائے ہے

بچے بھی دُور دُور سے دیکھیں ہیں غور سے
کیا واسطہ ہے اُن کو ضعیفی کے دور سے

ہم کو، ہماری عمر کہاں لے کے آ گئی
اعصاب پر یہ غم کی گھٹا کیسے چھا گئی

جو چھوڑ کر گئے تھے وہ آتے ہیں خواب میں
کس مامتا سے ہم کو بُلاتے ہیں خواب میں

ابّا کھڑے ہیں دُور سے پھیلائے ہاتھ کو
امّی بھی روز آتی ہیں خوابوں میں رات کو

ہے انتظار اُن سے ملیں گے بروزِ حشر
جن کے خیال سے مری ہوتی ہے آنکھ تر

سمجھے تھے یہ کہ لائے ہیں دنیا میں عمرِ نوح
پَر تولتا ہے اُڑنے کو کب سے پرندِ رُوح

اے موت ہو رہا ہے ترا کب سے انتظار
اب تھک گئے ہیں سانس کے چلنے سے بار بار

☆☆☆

ابّا کے انتقال پر

آمدِ موت کا کل رات کو منظر دیکھا
سانس اُکھڑی ہوئی تھی اور نزاع کا عالم

دل کے چلنے میں تھکے ہارے مسافر کا خرام
سُوکھی آنکھوں سے جھلکتا ہوا دیرینہ غم

رات بھر سلسلۂ کشمکشِ موت و حیات
نیند آتی تھی کبھی، ضعف سے اُکھڑا ہوا دم

بزمِ احبابِ شبِ زیست کا کرتے تھے خیال
یاد امّی کی کبھی باپ کا اندازِ کرم

ملک الموت! تو آجا کہ سفر ہو یہ تمام
بے تھکا ہارا مسافر، نہیں اُٹھتے ہیں قدم

مثال کے طور پر ان کے یہ اشعار ملاحظہ فرمائیے:۔

موجِ شباب ہم بھی تو دیکھیں اُو پردادار
ٹکرا رہی ھے حُسن کے ساحل سے کس طرح

☆☆☆

سرورِ نغمگی میں وہ نشاطِ کیف کا چھانا
خیالِ یار کا آنا، خیالِ یار کا جانا

☆☆☆

سرسراہٹ جب ہوا کی شب کی خاموشی میں ہو
اس کے لہراتے ہوئے آنچل کا آتا ہے خیال

☆☆☆

حُسن کی تعریف میں کیا کچھ نہ لکھا گیا ہے۔ یہاں امیؔر کا ندرتِ اندازِ بیاں کو مسدّس کے پیرہن میں دیکھیں:

نہ عطر چھڑکیں گل و یاسمیں کے دامن پر
قبائے قوس قُزح پر کریں نہ رنگ ریزی
صبائے شوخ کو نہ درسِ خوش خرامی دیں
کریں نہ چشم غزالاں میں سرمہ آمیزی
وہ سادگی سے کریں اپنی جلوہ آرائی
جنھیں ملی ہے خدا کی طرف سے زیبائی

دے شِفا اُن کو خدا یا تو اُٹھا لے اُن کو
تیرے بیمار پہ کب سے ترا جاری ہے ستم

☆☆☆

Prof. SHARIB RUDAULVI
COLLECTION

قطعہ

زمینِ فکرِ غزل آسماں سے لائے ہیں
بساطِ لفظ کو معنی سے کردیا ہے بریں
امیدِ ذوقِ نظر کس سے کر رہے ہو امیر
اندھیری رات میں فیضانِ ماہ ہوتا نہیں

☆☆☆

بیت

رو دیئے سر کو پکڑ کے، ہو گئے خاموش پھر
صبر کیسے آئے گا، آپ کے جانے کے بعد

☆☆☆

خواب کے گوشوں میں

نوٹ :۔ والد بزرگوار کے انتقال کے بعد۔

پھر کوئی بستر بالیں پہ مری آیا ہے
پھر کسی نے مجھے چپکے سے اُٹھایا ہے ابھی
چشم حیراں میں جھلکتے ہوئے تابندہ نقوش
کس کی آواز نے یوں پھر سے جگایا ہے ابھی

شب دیجور ہے اور خانۂ تنہائی میں
جانے یہ کون خیالوں میں چلا آتا ہے
جس کی میعاد، تصوّر سے نہیں ہو آگے
وہ حقیقت کا سا انداز لئے جاتا ہے

ہے حقیقت یہ مگر دل کو میں سمجھا نہ سکوں
جانے والے نہ کبھی لوٹ کے آئیں گے ادھر
انہی خوابوں کے دریچوں سے نظر آئیں گے
جو کہ مہجور ہوئے چھوڑ کے یہ خالی گھر

کتنی یادیں ہیں جو ہر شب کو اُٹھا دیتی ہیں
پیار، ایثار کے قصے ہوں تصوّر میں عیاں
وہ محبت جو مجھے اب نہ میسّر ہوگی
جانے کس بُرجِ فلک پر ہوئی آسودہ مکاں

جانے والے کو بھلا کون بتا سکتا ہے
راہِ ہنگام میں اک موڑ پہ چھوڑا تھا جسے
یوں ہی بیٹھا ہوا تکتا ہے فلک زاروں کو
شبِ بے خواب میں اک رُوح سے ملنا ہے اُسے

☆☆☆

بیت

راہِ حیات سے کوئی گزرا نہ بار بار
کر لو مزے کہ کل کا نہیں کوئی اعتبار

☆☆☆

دواخانے سے

نوٹ:۔ میرے دوست ڈاکٹر قدوائی صاحب نے بسترِ مرگ سے یہ شعر سُنایا:

لڑکے باپ کی خدمت گزاریاں کب تک کریں
بوڑھوں کو موت نہ آئے تو بوڑھے بھی کیا کریں

اس شعر سے متاثر ہوکر ذیل کے اشعار لکھے گئے ہیں۔ اس گفتگو کے چند دن بعد قدوائی صاحب کا انتقال ہوگیا۔

کب تک یہ خدمتیں میرے بچے بھلا کریں
آئے نہیں جو موت تو بوڑھے بھی کیا کریں

دنیا کی آرزو ہے نہ جینے کا شوق ہے
برحق فنا ہے، موت کی اب التجا کریں

"رحمت پہ اُسکی میرے گناہوں کو ناز ہے"
ڈر ڈر کہ اس جہان میں ہم کیوں رہا کریں

"پیمانہ بھر چکا ہے چھلکنے کی دیر ہے"
میری جزا و خیر کی یاراں دعا کریں

بیمار کو شفا نہ ہوئی جب علاج سے
کہنے لگے طبیب کہ بس اب دُعا کریں

آنکھوں میں نور اب نہ سماعت ہے گوش میں
دُھند بڑھ رہی ہے رات کا، روشن دِیا کریں

لکنت زبان میں، نطق پہ قابو نہیں ہے اب
ہوتی نہیں جو بات تو، کیا مُدعا کریں

ہم نے تو شکوہ ربِّ جہاں سے نہیں کیا
انسانِ ناتواں کا بھلا کیا گِلہ کریں

جو کچھ کہا سُنا ہے اُسے کیجئے معاف
مجھ پر کرم یہ آخری بندے، خدا کریں

اعطاف ہوگئے ہیں میری جان پر گراں
کس کس کا شکریہ دمِ آخر ادا کریں

دامن بچا بچا کے چلے ہیں جو ساری عمر
آفاتِ رستہ خیز سے کیوں وہ ڈرا کریں

احسان لیں، یہ اپنی تو عادت نہیں امیرؔ
نادار اسطرح سے بھلا کیوں جیا کریں

☆☆☆

ابیات

سامنے آئے ہیں جب بھی، چُپ سی ہم کو لگ گئی
یار ہنس ہنس کر یہ کہتے ہیں کہ بھائی کیا ہوا

☆☆☆

سبق شکست سے لیتا ہے وہ ہی مردِ جواں
کہ کامرانیٔ منزل کی آرزو ہو جسے

☆☆☆

نظمیات:

ذکرِ دنیا

عِلم و تحقیق و تلاش و نظر و فکر و عمل
یہ رہیں زادِ سفر، حق کے مسافر کے لئے

☆☆☆☆☆

بازگشت

جس طرح نیند سمٹ آئے تھکی آنکھوں میں
جس طرح پھیلتی ہو پھول سے خوشبو کی مہک

جس طرح ماہ سے ہو جائے طلائی منظر
جس طرح گلشنِ ویراں میں ہو بلبل کی چہک

ایسے بھولے ہوئے بچپن کا خیال آیا ہے
اپنے اُجڑے ہوئے گلشن کا خیال آیا ہے

☆☆☆

نیند

نیند آئی ہے، ڈھل رہی ہے رات
مضمحل ہوگئے ہیں پائے خیال

بے خودی چھا رہی ہے ہستی پر
مِٹ رہا ہے وجودِ ماضی و حال

سر سرانے لگی ہے بادِ صبا
پھیلتے جا رہے ہیں خواب کے جال

گرد دل کی سمٹ کے دور ہوئی
نور پھیلا رہا ہے اُن کا جمال

☆☆☆

تمکنت

طفلِ ناداں کی طرح جو کھیلتا دریا پہ ہے
شوقِ تیراکی میں ساحل سے نکل جاتا ہے دُور
جاہ و حشمت کے نشے میں، تمکنت کی موج پر
کر گیا حدِ بساطِ جاں و دل کو میں عبور

آکے گھیرا جب بھنور نے اور نہنگ آگے بڑھے
میری نازش اور اَنا کا اُڑ گیا سارا غرور
وہ خدا بھولا تھا جس کو، یاد پھر آنے لگا
موت آئی جب، ہوا اپنی حقیقت کا شعور

بچ نہیں سکتا کوئی اس وقت کے گرداب میں
بہہ رہا تھا طفلِ ناداں کی طرح سیلاب میں

☆☆☆

آپ نے دیکھا کہ نفس پرستی کو دعوت دئے بغیر مسدّس کو پڑھنے سے ایک پاک محبت کا نقشہ ہماری آنکھوں کے سامنے چھا جاتا ہے۔

امیرؔ کی نظموں میں حساسیت اور اثر پذیری بھی نمایاں حیثیت رکھتی ہے۔ واقعہ نگاری اور تصورات کے سلسلہ میں انہوں نے جس قوتِ بیان، جزئیات ونکتہ آفرینی اور مشاہداتی باریک بینی کا مظاہرہ کیا ہے۔ اُن کے وضاحتی جائزے کے لئے انکی نظمیں نشاطِ شب، چودھویں کا چاند، حرف تشکر، ڈل لیک پر شہر کا منظر اور آمدِ شب، بنڈی کا سفر، عطف وغیرہ کا جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔

ان کی نظم ''نشاط شب'' میں اہتمام نشاط کا بیان اور منظر کشی کس خوبصورتی اور سادگی سے کی گئی ہے۔ ملاحظہ فرمائیں:

شہابِ ثاقب وکوکب ہے، نیم وا ہے قمر
فلک پہ نُور کے اس جلوۂ نظام کو دیکھ

امید وصل میں دل کو کئے چراغاں ہوں
امید خام کے اس حُسنِ اہتمام کو دیکھ

اور پھر عاشق اور ستاروں کی ہمنوائی کا منظر ان کی نظم ''ستارے'' میں ملاحظہ فرمایئے:

شب فراق میں ساتھی ہیں یہ مکین فلک
مری طرح سے کہاں نیند ماہ پاروں کو

یادِ طفلی

کچھ خبر ہے زندگی کی دوپہر ہے سامنے
گل نہیں، بلبل نہیں، ویراں کھنڈر ہے سامنے

اک حیاتِ درد گزری گردشِ ایام میں
آج میں تنہا کھڑا ہوں، زندگی کی شام میں

یاد اب بیتے دنوں کی اور بھی آنے لگی
زیست کی آنکھوں پہ جیسے نیند سی چھانے لگی

وہ لڑکپن کا زمانہ لہلہاتے کھیت میں
دوڑنا سوکھی ہوئی ندی کی پیلی ریت میں

نیم کی پیلی نبولی توڑنا پتوں کے بیچ
بیر کی جھاڑی پہ پتھر پھینکنا کانٹوں کے بیچ

باغ سے کیری چرانا گرمیوں کی دھوپ میں
تھی تپش سے زرد رنگت بچپنے کے روپ میں

چر کی بلاّ کھیلنے میں روز ہی لڑتے تھے ہم
فکرِ دنیا تھی ہمیں اور تھا کوئی ہم کو نہ غم

پائے جامہ اور کُرتا، تنگ چوٹی تیل میں
گرد میں چہرا اٹا پاؤں تھے ننگے کھیل میں

پھر جو دیکھا وہ کھڑی تھیں، مجھ سے جیسے دُور دُور
تھا دوپٹہ دوش پہ، نظریں حیا سے چُور چُور

سر کو دے کر خم کیا جو ناز سے مجھ کو سلام
عشقِ اول کی شرابِ ناب کا پہلا تھا جام

اُس کا بچپن جا چکا تھا اور کلی کھلنے کو تھی
نوجوانی زندگانی سے گلے ملنے کو تھی

مدّتیں بیتی ہیں لیکن وہ زمانہ یاد ہے
آج بھی یادوں سے اُس کی دل مرا آباد ہے

اُن دنوں کی یاد آ کے تم کو تڑپاتی نہیں
جب برستی ہے گھٹا تو آنکھ بھر آتی نہیں

☆☆☆

قطعہ

کہتا ھے مجھ سے ہنسنے ہنسانے کے واسطے
نقش غمِ حیات مٹانے کے واسطے
ہستی میں میری آگ لگا کر وہ فتنہ گر
کہتا ہے دردِ دل کو بھلانے کے واسطے

☆☆☆

یادِ وطن

نوٹ :۔ حیدرآباد دکن کی یاد میں۔

میرے آگے کس لئے ذکرِ دَکن کرتے ہو تم
کیوں بیاں اے دوست، رُودادِ چمن کرتے ہو تم

جس شجر کی شاخ پر اب آشیاں اپنا نہیں
کیوں وہاں کا ذکرِ ریحان وسمن کرتے ہو تم

محورِ تہذیبِ عالم جو زمیں ماضی میں تھی
چشمِ دانا جس جگہ مصروف مباضی میں تھی

ارتقا پایا زباں نے اُس زمیں کی خاک میں
اخگرِ شعر وسخن ہے اب بھی اُس کی راکھ میں

تھا سلیقہ گفتگو کا، محفلِ ارباب میں
طُرّہٗ اخلاق تھا پیراہنِ آداب میں

فرقہ واری آگ سے لوگوں کے دل کالے نہ تھے
بن گئے ہیں جیسے اب، ایسے دکن والے نہ تھے

سارے موسم تھے وہاں کے معتدل اور بے نظیر
ندیاں، تالاب، نالے، وادیاں تھیں دل پذیر

گرمیوں کی ابتدا میں آم میں آتا تھا بور
دوپہر میں بن میں ہوتا کوئیلوں کا کتنا شور

دھان کے میدان پھیلے کوہ کے دامن تلک
وہ چراگاہوں میں بھیڑیں، نیلگوں اُن پر فلک

جب ہوا چلتی تو اُٹھتی خوشبوئے برگ و سمن
وادیوں کے پیچ و خم میں راستوں کا بانکپن

گولکنڈے کی اداسی عظمت ماضی کے ساتھ
کٹ گئے جس کو بچانے کیلئے لاری کے ہاتھ

[illegible] اورنگ زیب کا مقابلہ کیا۔

بلدیہ کی شام وہ بازار میں شور و ہجوم
وہ کبابوں کی مہک اور کھانے پینے کی وہ دھوم

پھول کے گجرے کہیں بکتے، کہیں پھولوں کے ہار
چادروں میں عورتیں، سرگرمِ چوڑی بازار

ترکی ٹوپی، شیروانی، میر عالم، عید گاہ
صورتیں وہ مخلصانہ نہ رہیں دنیا میں آہ!

انقلابِ دہر میں برباد دکھن ہوگیا
اک چراغِ آصفی تھا وہ بھی آخر سو گیا

☆☆☆

قندیل

نوٹ:۔ حیدر آباد کے پرانے شہر سے گھر لوٹتے ہوئے، افضل گنج کے قریب۔

رات کا وقت، یہی تھا کوئی نو، دس کا عمل
شب کے شانوں پہ تھے بکھرے ہوئے کالے بادل

تنہا راہیں تھیں، میں سائیکل پہ چلا جاتا تھا
شہر و بازار میں کوئی نہ نظر آتا تھا

دیکھا اک لڑکی کو بیٹھی ہے سڑک کے پہلو
نیند بچپن کی ہے آنکھوں میں، ہے سر پہ پلّو

گرد سے صورتِ معصوم پہ خشکی کا اثر
بال بکھرے ہوئے، صورت پہ عیاں رات کا ڈر

گیاس کا تیل تھا رکھا ہوا آگے اُس کے
بیٹھی تھی جس کو لئے ٹاٹ پہ جانے کب سے

تیل قندیل میں سیکل کا ڈلانے کے لئے
رُک گیا لیمپ کی بتی کو جلانے کے لئے

پیسے دے کر جو بڑھا آگے تو دیکھا میں نے
گر گئے پیسے جو ہاتھوں سے، لگی وہ رونے

پونچھتی تھی کبھی ہاتھوں سے بھری آنکھوں کو
تھی وہ حیران کہ کیا ہوگیا اُن پیسوں کو

دل بھر آیا مرا، دیکھی جو یہ حالت اُس کی
سوچا یہ میں نے بھلا ہوگی یہ دنیا کس کی

دیکھا پھر سُوے فلک اور پکارا میں نے
اے خدا تُو نے بھی دیکھا ہے جو دیکھا میں نے

دل مرا دیکھ کے معصوم کو کیوں روتا ہے
کچھ تو بتلا کہ کبھی دل بھی ترا کڑھتا ہے

☆☆☆

بخار

حال سنیے! بخار آیا ہے
مینہ برستا ہے، ابر چھایا ہے

چھینکیں آتی ہیں ناک بہتی ہے
خرخراہٹ گلے میں رہتی ہے

کھانسی اٹھتی ہے کیسی سینے میں
سردی لگتی ہے کچھ پسینے میں

پونچھے جاتے ہیں آنکھ کا پانی
سر کی تکلیف سے ہے حیرانی

چہرہ کیسا بگڑ سا جاتا ہے
سر پہ نزلہ جو چڑھ کر آتا ہے

گھر میں بستر پہ اک نظر ڈالی
دیکھا کمرہ ہے کس قدر خالی

اُوڑھا کمبل کو سر سے، سونے کو
دل تو چاہا تھا خوب رونے کو

ماں یہ کہتی تھیں نزلہ ہوتا ہے
جو میں کہتی ہوں، کون سُنتا ہے

سردی، بارش میں تم کو جانا تھا
ایسا گھر میں نہ روگ لانا تھا

بھائی بہنوں کو اب لگاؤ گے
ایسی باتوں سے باز آؤ گے

پی کے جوشاندہ لیٹ جاؤ تم
آب شورہ اور چٹنی کھاؤ تم

سپیدہ دم ترے عاشق کو نیند آ نہ سکی
ملے گا چین کہاں تیرے طلبگاروں کو

چلتے چلتے تصویر کشی کی ایک اور مثال ان کی نظم ''آمد شب'' میں بھی دیکھتے چلئے:

جھٹ پٹے کا وقت ہے، ہے سرمئی سا آسماں
دُور مغرب میں ابھی ہے ایک سرخی سی عیاں
طوق میں اپنے سیاہی گھیرتی جاتی ہے اب
دھندلے دھندلے ہو رہے ہیں نقشِ دنیا بامِ شب

امیرؔ کو انسانی جذبات و احساسات کی ترجمانی کرنے میں بھی ملکہ حاصل ہے۔ اس سلسلہ میں ان کے یہ اشعار جو انہوں نے اپنے والد ماجد کے انتقال پُر ملال کے سلسلہ میں کہے ہیں قابل ذکر ہیں۔ ایک شعر پر اکتفا کرتا ہوں:

رو دیئے سر کو پکڑ کے، ہو گئے خاموش پھر
صبر کیسے آئے گا اب آپ کے جانے کے بعد

ان کی نظم بہ عنوان ''سہیلی کے نام'' کا ایک بند ملاحظہ کرتے چلئے اور دیکھئے کہ وہ انسانی جذبات و احساسات کی ترجمانی کس سلیقے سے کرتے ہیں:

سرِ ورق پہ ترا نام جو لکھا میں نے
اور اس کتاب کو معنون تیرے نام کیا

چھایا ہلکا سا نیند کا سایا
ہلہلاتا ہوا بخار آیا

سر کی حالت عجب سی ہونے لگی
سردی، گرمی یہ کیسی ہونے لگی

ایسے لگتا ہے گر رہا ہوں میں
چکّر آتا ہے، پھر رہا ہوں میں

باتیں غفلت میں کیسے ہوتی ہیں
امّی پہلو میں بیٹھے روتی ہیں

رات جوں توں کٹی سحر آئی
پھر سے غفلت کی اک لہر آئی

سارے دن سوئے، شام کو جاگے
باندھے ہاتھوں میں منّتی دھاگے

ابّا دفتر سے آ کے بیٹھے ہیں
امّاں سر کو میرے سمیٹے ہیں

وہ بھی شاید مزاج پُرسی کو
لا کے بیٹھے ہیں پاس کرسی کو

بات سرگوشیوں میں ہوتی ہے
مجھ پہ چھائی ہوئی غشی سی ہے

پھر جو نزلہ ذرا سنبھلنے لگا
ہم کو پرہیز سخت کھلنے لگا

شورہ کھا کھا کے تھک گئے تھے ہم
کھانا ملتا تھا بے مزا اور کم

دیکھا کرتے تھے چٹ پٹے سالن
خوشبو دیتا بگھار کا لہسن

لوگ کھاتے تھے منہ کو تکتے تھے
ہم بھی منہ میں زبان رکھتے تھے

لیٹے لیٹے گزر رہے تھے دن
گھڑی، وقفوں سے کر رہی تھی ٹن

کرنیں سورج کی صبح آتی تھیں
چھن کے کھڑکی سے جگمگاتی تھیں

ذرّے جو بھی فضاء میں ہوتے تھے
زد میں کرنوں کی جگمگاتے تھے

ان کے دیکھے سے دل بہلتا تھا
کبھی گھبرا کے میں ٹہلتا تھا

صبح جاتی تو دوپہر آتی
اک تجلی کی دل کو برماتی

لیٹے لیٹے اُسی کو سُنتے تھے
بُھولی یادوں کے جال بُنتے تھے

کوئی انساں اِدھر نہیں آتا
دل بھی تنہائی سے تھا گھبراتا

نیند آتی تھی پھر، نہ جانے کب
شام ہوتی تو پاس آتے سب

یاد کرتے ہیں اُس زمانے کو
اب نہیں کوئی غم اُٹھانے کو

کر کے منظوم اس علالت کو
ہم نے لکھا ہے ایک حکایت کو

کیجئے تعریف گر سمجھ آئے
ورنہ محنت مری عبث جائے

☆☆☆

سہیلی کے نام

ہر ورق پہ ترا نام جو لکھا میں نے
اور اس کتاب کو معنون تیرے نام کیا
اٹھا کے پردہ ماضی کو یاد رفتہ نے
بڑے ہی پیار سے ہنس کے مجھے سلام کیا

دھواں سا دل میں اٹھا، آنکھ سے بہے آنسو
اٹھی اک ہوک سی سینے میں دل مچل سا گیا
تیرے نصیب تھا وہ جو زمانہ اقبال کا
چراغ کی طرح آنکھوں میں پھر سے جل سا گیا

پھر ایک رنگ تصور سے تجھے میں دیکھا
یہ سوچتی ہوں میں کتنی بدل گئی ہوتی
مری طرح سے جوانی کٹی، اس عمر میں
اک شام کی مانند ڈھل گئی ہوتی

ہر ایک حال میں تو میرے ساتھ ساتھ رہی
دیا ہے ہمتِ گشتہ کو بار بار ثبات
دوپٹہ تجھ ہی سے بدلا تھا میں نے بچپن میں
تری ہی یاد سے روشن رہی یہ راہِ حیات

☆☆☆

قطعہ

آنکھیں اپنی بچھائے بیٹھے ہیں
کان در سے لگائے بیٹھے ہیں
ہاں چلی آئی ہے یہ رسم کہن
عُود و عنبر جلائے بیٹھے ہیں

☆☆☆

پلنگ

یہ جو آتے ہیں نظر چادر و تکیے و پلنگ
یا دری، ٹاٹ کے ٹکڑے ہیں پڑے بر سرِ سنگ

یا کہیں اطلس و کمخواب میں بُنوائے ہوئے
عطر میں ڈوبے ہوئے، پھولوں سے چُنوائے ہوئے

آدمی پاتا ہے بستر ہی میں آرامِ حیات
اس کو ملتی ہے غمِ زیست سے اس میں ہی نجات

دن جو ڈھلتا ہے، تھکی رات چلی آتی ہے
گردشِ دہر سے جب روح بھی گھبراتی ہے

طاقتِ عزم و عمل سست سی پڑ جاتی ہے
نیند آنکھوں میں جوانساں کے چلی آتی ہے

اس کی آغوش میں سر رکھ کے وہ کھو جاتا ہے
طفلِ معصوم کی مانند وہ سو جاتا ہے

چراغ

راہی کی رہنمائی کی خاطر ہے جل رہا
کھڑکی میں جو کہ شام سے رکھا چراغ ہے
شب کے مسافروں کے لئے ہے قطب نما
منزل کا اُنکو اس سے ہی ملتا سراغ ہے

روشن کئے ہوئے ہے اگرچہ فضاؤں کو
بختِ سیہ کا دامنِ ہستی پہ داغ ہے
سربستہ فرضِ منصبِ ہستی میں جی رہا
میری طرح نہ جلنے سے اُس کو فراغ ہے

ہوتی نہیں یہ محفلِ رنداں کبھی امیرؔ
جلنے سے اُسکے محفلِ رنگ و ایاغ ہے

☆☆☆

پُرانے گھر

اونچی دیواروں کے گھر، بیت السکوں، دارالاماں
یاد ہے کیا آپ کو ان گزرے وقتوں کا مکاں

درمیانِ صحن کے اک حوض، فوارے کی دھار
گرمیوں میں کس قدر تھی رُوح بخش اُس کی پھوار

لیمو کے پودے کہیں ہوتے، گُل شبّو کے پھول
بیل بوٹوں سے مہکتا تھا زمیں کا ارض و طول

تھی رسوئی گھر پہ جالی، چولھے اور ہانڈیاں
کھانے کی خوشبو میں ہوتا پکّی لکڑی کا دھواں

رنگت رنگی لئے وہ شیشمی لکڑی کے در
آبپاشی جب کبھی ہوتی تو چمک جاتے تھے گھر

دیگچی، لوٹے، درِ حمام چند رکھے ہوئے
پاس صابن اور منجن، ایک صُراحی دو گھڑے

نقش، ماہ و سال کے تھے، یوں در و دیوار پر
جس طرح سے زنگ لگتا ہے کسی تلوار پر

چھت پہ کچھ پانی کے دھبے انقلاب دور سے
لیٹے لیٹے دیکھتے تھے جن میں شکلیں غور سے

ہلکی ہلکی کھانسیوں کے سلسلے وہ سانس میں
تھی مسالوں کی بھی خوشبو مرچیوں کی دھانس میں

طاق میں رکھی ہوئی قندیل، مٹی کے دیئے
اور گڑیا تھی کہیں رکھی ہوئی گھونگھٹ لئے

لکڑی کے مُگدر، طمنچے، زینت ایوان تھے
عہد ماضی میں یہی تو مرد کی اک شان تھے

اُٹھا کے پردۂ ماضی کو یادِ رفتہ نے
بڑے ہی پیار سے جھک کے مجھے سلام کیا

دُھواں سا دل میں اُٹھا آنکھ سے بہے آنسو
اُٹھی اک ہوک سی، سینے میں دل مچل سا گیا
تہہ خمود تھا وہ جو زمانہ طفلی کا
چراغ کی طرح آنکھوں میں میرے جل سا گیا

ہر ایک حال میں تو میرے ساتھ ساتھ رہی
تجھ ہی نے ہمتِ گشتہ کو پھر دیا ہے ثبات
دوپٹہ تجھ ہی سے بدلا تھا میں نے بچپن میں
تری ہی یاد سے روشن رہی یہ راہِ حیات

اس بند میں دوپٹہ کے بدلنے کی جو ریت یا رسم ہمارے کلچر میں ہے، امیرؔ نے محض اس کے تذکرے سے جس قربت و محبت کے رشتہ کو منسلک کر کے یاد دلایا ہے، وہ ماضی کی نامعلوم کتنی یادیں اور وارداتیں تازہ کرا دیتا ہے۔

میرے خیال میں امیر کی شاعری ان کی شخصیت کے اوصاف، ان کے طرزِ احساس، ان کے اندازِ نظر، ان کے اوضاع اور ان کے تاثرات کا ایک بہترین آئینہ خانہ ہے۔ مجھے ان کے فلسفہ زندگی اور شاعری میں بڑی مماثلت ملتی ہے۔ مختصر یہ کہ امیر کی

اپنی بدبختی سے آیا تھا ادھر انجانہ کیوں
اس پرانے شہر میں پھرنے لگا بیگانہ کیوں

بیٹھ کر دیکھا کیا، اُن جانے والوں کے نشاں
زندگی کیسے گزاری اِن گھروں کے درمیاں

گھر کے در، دیوار قصے مجھ سے جو کہنے لگے
داستانِ غم کو سُن کے چشمِ تر بہنے لگے

☆☆☆

قطعہ

خود چلی آئی ہے منزل موت کی میرے لئے
فیصلہ اپنا نہیں اب 'ہاں' و 'نا' کے درمیاں
غم نہیں کوئی نہیں، اب آرزو کوئی نہیں
ایک ہچکی رہ گئی بود و فنا کے درمیاں

بچپن کا گھر

جا کے جو دیکھا ہے میں نے شوق سے
مُدّتوں کے بعد بچپن کا مکان

تھی نظر حیران، یہ ہی گھر ہے وہ
جو تصوّر میں تھا کتنا عالی شان

کس قدر چھوٹے تھے کمرے، صحن و در
مختصر دیوان خانہ اور دالان

تھے بلند کتنے درخت وہ آم کے
زینہ بھی جاتا تھا سوئے آسمان

ہر نظر کے دیکھنے کا اپنا طور
ہر کسی کے سوچنے کی اپنی مان

ہو محل یا در حقیقت ہو مکان
عہدِ طفلی میں تھا میرا آستان

٭٭٭

غیر سے دل کی بات

جانے کیوں غیر کو قصہ یہ سنانے میں لگا
داغِ دل اُس کو میں کیوں آج دِکھانے میں لگا

غیر تھا وہ میرے واسطے، لیکن پھر بھی
تھی گھٹن ایسی مرے دل میں بتانے میں لگا

نکتہ چینی کا نہ ڈر تھا، نہ تو دشنام کا تھا
قصۂ درد کے ابواب گنانے میں لگا

دردِ دل ختم گیا، کہنے سے یہ دل کی باتیں
غیریت میں یہ سکون جانے کیوں پانے میں لگا

اس نے کی چارہ گری، مجھکو سہارا سا ملا
دل کے بکھرے ہوئے ٹکڑوں کو اُٹھانے میں لگا

فکرِ صحت

جینے کی آرزو میں مرے جارہے ہیں ہم
مرنے کا نام سُن کے ڈرے جارہے ہیں ہم

امکاں کئی ہیں مرض کے، اندیشے صد ہزار
اس دغدغے میں یعنی جلے جارہے ہیں ہم

وقتِ شفا کو کہتے ہیں تریاق ڈاکٹر
دیتے دوا ہیں جو بھی، پیئے جارہے ہیں ہم

ڈائٹ ہزار ہیں کئی گیرنٹیوں کے ساتھ
ڈائٹ کے فائدوں کو گنے جارہے ہیں ہم

کھانے کا کچھ مزا ہے نہ پینے کا کچھ مزا
متروک ہر غذا کو کئے جارہے ہیں ہم

Prof. SHARIB RUDAULVI
COLLECTION

ورزش پہ زور ٹھیک ہے، لیکن کیوں چار دن
چلتے ہیں دو قدم تو تھکے جا رہے ہیں ہم

سُن سُن کے تھک گئے کئی بیماریوں کا حال
پھر بھی ادب میں اُنکی سُنے جا رہے ہیں ہم

ہر طرح اعتدال ہو صحت کے باب میں
نسخہ یہی ہے، پند دیئے جا رہے ہیں ہم

حکم خدا سے آئے گی اک دن امیرؔ موت
مرنے سے پہلے کیوں یہ مرے جا رہے ہیں ہم

بیت

جب نہیں منزل مقرر، راستہ گم نام ہے
اے مسافر، کس لئے کرتا ہے تجدید سفر

لفظ کی چارہ گری

فکر خاموش تھی، جذبات بھی پسماندہ نشیں
خامہ سوکھا تھا، اور انشاء کو بھی کھویا تھا کہیں

ایسے حالات میں بیٹھا تھا کہ کیا لکھوں میں
رقص کرتا ہوا کاغذ پہ اٹھا لفظ حسیں

اپنی ہستی میں چھپائے ہوئے صد رنگ ہنر
آکے کہنے لگا چلتے ہو سر عرشِ بریں

واں دیکھو گے خیالوں کی نئی دنیا کو
کبھی دیکھو گے فصاحت کو، بلاغت کے قریں

اُس کی آواز پہ جاگے مرے خوابیدہ خیال
جھنجھنانے لگے احساس مرے دل کے تئیں

آگے جو اور بڑھا، ذہن کی پنہائی میں
رقصِ الفاظ سے ہونے لگے اشعار قریں

گہرا جذبات کا اُٹھنے لگا، جو آگے بڑھا
وجد کی گود میں جب نطق نے رکھ دی تھی جبیں

نغمہ بنتا رہا، تصویر بھی کھنچتی ہی رہی
شعر کی ساوئیں تا دیر اُبھرتی ہی رہیں

قطعہ

پھر سے نالاں ہے دلِ زار، چلے بھی آؤ
چشمِ حسرت کا ہے اصرار، چلے بھی آؤ
لے کے سوغات ستاروں کی کھڑی ہے لیلیٰ
منتظر ہیں در و دیوار، چلے بھی آؤ

تصوّف

بعدِ جنوں ہے بے خودی ازبس کہ بے نیاز ہوں
یعنی نشاطِ عشق سے ساقی میں سرفراز ہوں

ظلم و ستم کی حد نہ رکھ دیکھوں میں غم کی انتہا
ترکِ ادب اگر نہ ہو شاید میں خود مجاز ہوں

نے ہو سکا تو دادرس اور میں نہ کر سکا سوال
تو بھی خدا نہ بن سکا میں بھی نہ چارہ ساز ہوں

ترکِ طلب سے پائی ہے میں نے مرادِ زندگی
اب جو نہیں ہیں خواہشیں تو میں نہ شکوہ باز ہوں

دنیا سے بے نیاز میں پہنچا جنونِ عشق تک
گر تو کمالِ عشق ہے، میں بھی تو تیرا راز ہوں

☆☆☆

نصبُ العین

دل میں کیسی بے کلی سی آ گئی
جُھٹ پٹے کی کیفیت سی چھا گئی

جی نہیں لگتا کسی بھی کام میں
اب طبیعت کس قدر مُرجھا گئی

دل میں بے چینی سی کیوں رہنے لگی
زندگی صورت یہ کیا دکھلا گئی

رونقِ محفل بھی اب بھاتی نہیں
زیست تنہائی سے بھی گھبرا گئی

یہ خلش کچھ عشق کے باعث نہیں
فکرِ دنیا بھی نہیں جو کھا گئی

لوگ کیا سمجھیں گے میرے دل کا حال
دل کی حالت خود ہمیں اُلجھا گئی

ہر شہابِ آسماں ٹوٹا ہے جب
اپنی پروازِ سفر یاد آ گئی

تھا رواں ماحول اور جاری سفر
ناؤ کس پتھر سے جا ٹکرا گئی

اپنی حالت جو بیاں کرنے لگا
لڑکھڑا کر یہ زباں جھلا گئی

سُن کے میری بات بولے شیخ جی
بد مکافاتی قیامت ڈھا گئی

یہ ہوا سے پوچھ بیٹھا تھک کے میں
ایسی تبدیلی کہاں سے آ گئی

شاعری میں تاثیر و جاذبیت کے ساتھ بے ساختگی اور ندرت کی جلاوت ہے۔ ان کی غزلوں میں زبان کی خوبیوں کے علاوہ تغزل پایا جاتا ہے۔ اور ایک منفرد اسلوب نگارش اور مخصوص لب ولہجہ ان کی نظموں کی پہچان ہے۔ ہاں، ان کی نظموں کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ اُن کا اقتباس پیش کرنا بہت مشکل ہے۔ مجھے قوی امید ہے کہ آپ ان کے کلام سے محظوظ ہونگے۔

—ڈاکٹر انیس قدوائی

Vice President, University of Spokane

اسپوکین۔ واشنگٹن ۱۱/اکتوبر/۱۹۹۳ء

نوٹ:۔ ڈاکٹر انیسؔ قدوائی صاحب، میرے محسن اور میرے دوست کا انتقال دسمبر ۲۰۰۸ء میں اسپوکین، واشنگٹن میں ہوگیا۔ اُن کے جانے سے میری ادبی دنیا سونی سی ہوگئی۔ انیسؔ قدوائی شاعر اور انشاء پرداز ہونے کے ساتھ ساتھ ایک شریف اور ہردلعزیز انسان تھے۔ نامور خاندان سے تعلق تھا۔ وہ لکھنؤ اور اُردو تہذیب کی ایک خوبصورت مثال تھے۔ لکھنؤ کے قریب جو ان کا محل تھا وہ انھوں نے مسلم انجینیر نگ یونیورسٹی کے قیام کے لئے وقف کر دیا۔ جبکہ وہ اس کی فروخت سے کروڑوں کی رقم حاصل کر سکتے تھے۔

—سید جعفر امیرؔ رضوی

ہے بظاہر آج بھی ہر شے وہی
بات ایسی کیا ہے جو تڑپا گئی

رُک گئی بادِ صبا، ہنس کے کہا
ہیں بہت جن کو یہ حالت کھا گئی

یہ زمانہ بھی گزر ہی جائے گا
گردشِ ایام یہ سکھلا گئی

تیری ہستی کا نہیں جو نصبُ العین
اس لئے طبیعت تیری گھبرا گئی

مقصدِ ہستی نہ ہرگز کھوئیے
جاتے جاتے یہ صبا بتلا گئی

فلسفہ حیات

ہوئی جو رندِ بلاکش سے شب کو بات مری
سوال پوچھا، بتا کیا ہے تیرا رازِ خوشی

ملا ہے کیسے بلاؤں سے اس جہاں کی مفر
شکن نہ تیری جبیں پہ نہ تیری آنکھ ہے تر

غیور طبع ہے، دولت سے بے نیازی ہے
نہ فکر کل کی ہے تجھ کو نہ یاد ماضی ہے

نہ دہر کا تجھے غم ہے، نہ غم ہے یاراں کا
ہے طور کیا یہی عالم میں اہلِ عرفاں کا

یہ ہنس کے اُس نے کہا، پوچھتے ہو رازِ خوشی
اسی سوال پہ کہتا تھا مجھ سے کُہنہ رشی

یہ نکتہ عین ہے یارانِ نکتہ داں کے لئے
کہ دل لگائیں نہ دنیا سے، دردِ جاں کے لئے

☆☆☆

دروغ کی شکلیں

دیتا شیطان ہے آیت کے حوالے سے ثبوت
یعنی قرآن سے دیتا ہے گناہوں کے جواز
مسکراتا ہے چھپانے کو عداوت اپنی
اپنی روباہی پہ عیار و منافق کو ہے ناز
فسق و باطل کو حسیں شکل میں ظاہر کر کے
روپ دیتا ہے صداقت کے کئی فتنہ طراز

دل میں رہتا ہے چھپا، یہ نہ کوئی جان سکے
روحِ بدکار کی نیت کو نہ پہچان سکے

چغل خور

ہر ایک سے شکوہ اُس کا ہے
الزام ہر اک کو دیتا ہے

لوگوں کے حوالے سے باتیں
وہ اپنے دل کی کرتا ہے

کہتا ہے یقیں سے جھوٹ بہت
سچ سے نہیں مطلب اُس کا ہے

''میں نے تو سُنا، سمجھا تھا یہی''
جو پوچھے کوئی وہ کہتا ہے

جب اُس سے آ کر کوئی ملے
وہ ساری عمر پچھتاتا ہے

وہ تخم عداوت رشتوں میں
جاتا ہے جدھر، بو جاتا ہے

مشکل ہے سمجھنا اس کو بہت
معصوم سا بن کے رہتا ہے

☆☆☆☆

قطعہ

یاد مجھکو نہ رہے تلخیٔ ہستی ساقی
دے مجھے خواب، مجھے رحمت بے ہوشی دے
کچھ تو دے، ہوں میرے احساس گراں بار سبک
نہ رہے درد جگر، ایسی تو بے خبری دے

☆☆☆☆

بحث برائے بحث

کچھ تو سُن لو، اگر مگر نہ کرو
بحث و تکرار، شور و شر نہ کرو

صاحبِ رائے ہم بھی ہیں کہہ کر
اپنی حُجت کو معتبر نہ کرو

تُو تُو میں میں سے کیا ہوا حاصل
بات اُلجھا کے اس قدر نہ کرو

ہم خیالی بھی کچھ رہے یارو
ہمنوائی، چلو اگر نہ کرو

جس سے نقصان تم کو ہوتا ہے
ایسی باتوں کو در گزر نہ کرو!

کبھی اَوروں کی رائے بھی سُن لو
اُس پہ چاہے عمل کرو، نہ کرو

سیکھ لو تم بھی مصلحت بینی
نکتہ چینی کو مختصر بھی کرو

☆☆☆

قطعہ

زلبس ثبوت ہے یہ میرے پیار کا اے دوست
ترے دروغ کو سر اپنے لے لیا میں نے
یہ جانتا ہوں کہ فطرت سے تو ہے ہرجائی
ترے گناہ • زیاں کو روا کیا میں نے

گردشِ دوراں

کوئی اس وقت کو، اس گردش دوراں کو ٹھہرائے
طلاطم اور تغیر اس جہاں میں اب نہیں آئے

رہے دائم شباب و حسن کے جلوے میرے آگے
جنون عشق میرا پھر سے جاگے، ہوش میں آئے

یہ آخر، وقت کی فطرت میں سیل بیکراں کیوں ہے
یہ پیماں روز و شب کا کس لئے ہے، کوئی سمجھائے

بیت

زندگی کے سارے رشتے توڑ کر جاتے ہیں ہم
اس جہاں کو، اللہ بیلی، چھوڑ کر جاتے ہیں ہم

نظمیات:

وطن ۔ مذہب ۔ ملّت

ثبوتِ حق میں ہے پھولوں کی جلوہ آرائی
سحر کو زینتِ گلشن کی یہ صدا آئی

☆☆☆☆☆

سوئی ہوئی ملّت کو جگاؤں کیسے
کھوئی ہوئی عظمت کو میں لاؤں کیسے
بے نام و نشاں اور بھی کرنے کو فلک
تیار ہے، ملّت کو بتاؤں کیسے

جلوۂ طُور

جلوۂ نُور سے تھی دید کی حسرت رسوا
دیکھتا تجھ کو ہوں میں موند کے آنکھیں اپنی

ایک احساس پہ باقی ترے ہونے کی دلیل
ایک امید پہ کرتا ہوں دعائیں اپنی

رہ گئیں باتیں کئی تشنہ تری باتوں میں
بھیجتا گرچہ رہا ہم کو کتابیں اپنی

ہاں نظر آنے لگے مجھ کو نشاں منزل کے
شہرِ خاموش سے گزری ہیں جو راہیں اپنی

توشیحی نظم

سیدؔ جعفر امیرؔ

نذیرؔ فتح پوری

س — سرفرازی کے قلم ! قصے سنا
ذکر کر اک صاحبِ ادراک کا

ی — یوں لٹائی روشنی افکار کی
ذہن و دل سے تیرگی جاتی رہی

ی — یہ بھی فکر و فن کا اک اعجاز ہے
خوبصورت شعر کا انداز ہے

د — دل میں ہے تعمیر کا جذبہ نہاں
روح میں ہیں فکر کی پرچھائیاں

ج — جب ہوئے احساس کے روشن چراغ
جگمگا اٹھے اندھیروں کے دماغ

ع — عشق کی ہے رہ گزر قدموں تلے
ہیں محبت کے سفر قدموں تلے

وطن کے لئے دُعا

یہی دعا ہے مری اس زمین کو یارب
نگارِ جنّت و فردوسِ بر زمیں کر دے

فراز، موج کو اتنا ہو آبِ کوثر کا
غبارِ دشت پہ بکھرے تو آبگیں کر دے

بہت چراغ ہیں افلاک پر جو جلتے ہیں
انہیں وطن کی گزرگاہ پہ رہ نشیں کر دے

ترائی سبزۂ گندم سے لہلہاتی ہو
زمیں کو سونا، تو ہر سنگ مرمریں کر دے

کفیل کر تو سلیمان کو اُن ہواؤں کا
جو بادِ شرط ہو، اس ملک کے تئیں کر دے

یہ جانتا ہوں بھٹک سے گئے ہیں میرے رفیق
رسولِ پاک کا صدقہ، اُنہیں امیں کر دے

ہجومِ عُسرت و ناچارگی میں کھو سے گئے
پھر اُنکو دولتِ ایماں سے بہتریں کر دے

ہر ایک رہبرِ ذی شاں کو دے مسیحائی
ہر ایک فرد کو جمہوریت گزیں کر دے

نہیں جو میرے فصاحت کے معترف اُنکو
شعورِ شعر و ادب سے بصد ذہیں کر دے

ہو شاد بادِ وطن، ہے امیرؔ سر بہ سجود
دُعا کو اس کی تو مقبولِ بالیقیں کر دے

☆☆☆

وطن لوٹنے پر

اس دیس میں یہ کیسا انسان کا ترسنا ہے
پینے کو نہ پانی ہے، کھانے کو نہ کھانا ہے
کیا تھا یہ وطن اپنا بچپن کی وہ یادوں کا
کیسا یہ تغیر ہے، آشوبِ زمانہ ہے

تقلیب زمانہ نے ترتیب بدل ڈالی
وہ کوچے نہ گلیاں ہیں اپنا نہ یگانہ ہے
ڈھونڈے سے نہیں ملتی تہذیب پرانی اب
آداب کا، ملنے کا، اب وہ نہ قرینہ ہے

ہر چیز ہوئی عنقا، افراط ہے انساں کا
[illegible] سے زمیں عاری، ہر گوشہ برہنہ ہے
ہے گرد فضاؤں میں، پھیلا ہے دھواں ہر سو
سونے کو نہ بستر ہے، رہنے کو نہ خانہ ہے

کیا سوچ کر آئے تھے، کیا دیکھا امیر آخر
اب غیر کی بستی میں گھر اپنا بنانا ہے

قُرطبہ کی مسجد میں

(علامہ اقبالؒ سے خطاب)

قُرطبہ میں ہوں، ادھر سامنے مسجد کا مزار
ایک بستی ہے پرانی سی، فصیلیں دیوار
پیچ کھاتی ہوئی گلیوں میں مکانوں کی قطار
گنبدیں دامنِ دریا پہ، پرانے بازار

ذکر جو اُس کا سنا تھا تو چلا آیا ہوں
دردِ دل ساتھ لئے شوقِ نظر لایا ہوں

فرش پتھر کے وہی، راہ پہ ماضی کے نشان
جالیاں لوہے کی روزن پہ، ہیں بوسیدہ مکان
تختیاں نام کی دہلیز پہ، محرابی کمان
در و دیوار پہ سوئے ہوئے نصِ قرآن

بیٹھا کب سے ہوں ادھر دیکھتا یہ وقت و مقام
ایک بُھولی ہوئی تہذیب کی کھوئی ہوئی شام

تُو بھی آیا تھا اِدھر دیکھنے یہ نقشِ جمال
اِسی مسجد میں تقدس کی حرارت کا کمال
بود و نابود کی تقلیبِ زمانہ کی مثال
عصرِ حاضر میں جھلکتے ہوئے ماضی کے خیال

قلبِ تاریخ کو ہے حرکتِ دوراں، دیکھوں
صبح کا وقت ہے، میں شامِ غریباں دیکھوں

جانے کیوں دیکھ کے اس آنکھ سے بہتا ہے لہو
نہ پڑھیں میں نے نمازیں، نہ کیا میں نے وضو
نیتیں نیک نہیں، منہ سے کریں اللہ ہُو!
مدتوں سے ہے ترے قوم کی بگڑی ہوئی خُو

ہے مؤذن، نہ کوئی ہمدمِ خدا ساز نہیں
ہاں ترے پندِ خودی کی بھی تو آواز نہیں

☆☆☆

THIS EBOOK IS DOWNLOADED FROM
SHAAHISHAYARI.COM

LARGEST COLLECTION OF URDU
SHERS, GHAZALS, NAZMS AND EBOOKS.

بابری مسجد

زینہ ہے بکھرا ہوا، ٹوٹا ہوا بابِ حرم
دُوب اُگتی ہے سسکتی ہوئی دیواروں پر
گونجتی گُنبدِ ویراں میں ہے خاموش اذاں
مرثیہ خواں ہے کوئی اونچے سے میناروں پر

چُونا ہوتا ہے گِل و سنگ کی بندش سے الگ
منتشر صورتِ ویرانہ عمارت کا جڑاؤ
بکھری اینٹوں کے شگافوں میں نظر آتا ہے
آہ! تخریب بکف، رودِ زمانہ کا بہاؤ

آ گیا خَم سا سُتونوں میں جو استادہ تھے
نہ رہی قبلہ نما اب یہاں محراب کوئی
خشک ہے حوض، گُلِ شبو بھی سُوکھا کب کا
نہ رہا سایہ شجر کا یہاں شاداب کوئی

ہوتا ہے کاغ کسی پیڑ پہ اب نوحہ سرا
بکریاں صحن میں آزادی سے پھرتی ہیں یہاں
نہ تو انسان نہ فرشتوں کا نشاں ہے کوئی
بالا خانوں میں کبوتر نے کیے اپنے مکاں

یہی مسجد تھی جہاں ذکرِ خدا ہوتا تھا
اسکی ہستی سے تقدس تھا مسلمانوں میں
اذاں یہیں سے بلاتی تھی دین داروں کو
درس و تادیب کا چرچا تھا ان ایوانوں میں

دیکھا جو منظرِ تقلیب تو آیا یہ خیال
کیا تھے اسباب وہ، جو باعث تخریب ہوئے
کس کی نادانی کا ثمرہ ہے یہ اندوہ زوال
کس کی اماری سے ہم باعث تعذیب ہوئے

آئی آواز کہ تم راہِ خدا بھول گئے
عیش و عشرت میں رہے، کھوئی بضاعت ساری
نہ تو تاریخ نہ مذہب سے سبق کچھ سیکھا
خانہ جنگی میں رہے، کھوئی حکومت ساری

نہ سیاست نہ تدبّر سے کیا نظمِ بقا
نہ تو تبلیغ کی کاوش تھی نہ قرآں پہ عمل
بس کہ کافی نہیں اصرار نمازوں کا فقط
اچھے اعمال بھی ایمان کا ہیں جُزوِ اٹل

بات غائب کی سُنی جب تو کیا پھر یہ سوال
وہ جو سُنتے نہیں، میں اُن کو سناؤں کیسے
اگلے وقتوں میں یہ اقبالؔ بھی کہتے تھے امیرؔ
میں محمدؐ کی اِس اُمّت کو جگاؤں کیسے

☆☆☆

رُوحِ ابنِ بطوطہ کا خطاب

(قوم کے نوجوانوں سے)

دوستو آؤ! ہمیں پھر سے سفر کرنا ہے
اپنے پیغام کی دُنیا کو خبر کرنا ہے

اٹھو! اٹھو! کہ ہمیں شب کو سحر کرنا ہے
بحر و بر، زیر و زبر، سینہ سپر کرنا ہے

پھر سے جاگی ہے مرے دل میں تمنائے سفر
ہاں نہیں مردِ مسلماں کو سیاحت سے مفر

ہر اُفق پر نیا پرچم ہے اُڑانا ہم کو
ہر زمیں پر نئی بستی ہے بسانا ہم کو

خونِ ایماں کی ابھی دل میں روانی ہے بہت
اس فسانے کی ابھی اور کہانی ہے بہت

ف — فکر و فن سے ہے مزین جو جبیں
مائلِ سودوزیاں ہوتی نہیں

ر — رہنمائی کی، قلم قرطاس نے
پائی منزل آپ کے احساس نے

ا — ابرِ احساسات کی چھاگل کُھلی
ارضِ فکرِ نو بھی جل تھل ہو گئی

م — مہک اٹھے آرزوؤں کے گلاب
خوشبوئیں چاروں طرف پھیلیں شتاب

ی — یوں بھری ہے مانگ نظموں کی سدا
آپ نے ان کو سہاگن کر دیا

ر — رنگ لالہ کو لہو دل کا دیا
گلشنِ افکار تازہ ہو گیا

کون ہے یہ زلفِ اردو کا اسیر
نام نامی آپ کا جعفر امیر

زُور طوفاں کا کئی بار ہے توڑا ہم نے
ٹوٹی کشتی کو کئی بار ہے جوڑا ہم نے

ہاں شکستوں سے ہی سیکھا ہے اُبھرنا ہم نے
کھوئے رستوں پہ نئے گام کو پایا ہم نے

کی ہے لغزش تو تدبُّر نے سنبھالا ہے ہمیں
جہد کا راستہ دنیا کو دیکھایا ہم نے

شیر دل وہ ہیں جو طوفاں سے لڑا کرتے ہیں
ہم نہیں وہ کہ جو بجلی سے ڈرا کرتے ہیں

ہم میں گو آج وہ پہلی سی حرارت نہ رہی
بے خطر جوشِ جوانی کی وہ طاقت نہ رہی

پھر بھی اسلاف کا وہ جاہ و حشم باقی ہے
قطرہ دریا کو کریں، ہم میں وہ دم باقی ہے

منزل اپنی ہے تو توحید عمل جاری ہے
شب کی آغوش میں بھی عالمِ بیداری ہے

ہاں چلیں دُور چمکتے ہوئے سیاروں میں
ہے زمیں اور بھی ان بکھرے ہوئے تاروں میں

☆☆☆

قطعہ

جب نظر میں منزلِ مقصود تیری ہے نہیں
جادۂ ہستی پہ پھرتا تو رہے گا دربدر
جب نہیں زادِ سفر، قبلہ نما کوئی نہیں
کس لئے پھر کر رہا ہے زندگی کا یہ سفر

☆☆☆

طاقتِ اتحاد

کہرے سے اوس بنتا ہے، گل پر ہو رونما
دریا سے مل کے ہوتا ہے طوفانِ بے قرار
تزئین موجِ حسن گُلِ تر، جو تنہا ہے
ہوتا ہے اشتراک سے موجوں کا انتشار

دیتا ہے درس قطرۂ ناچیز بار بار
لوگوں کے اتحاد میں ملّت کو استوار

☆☆☆

قطعہ

نہ سمجھ غیب کی آفات انھیں
ان میں ہوتا ہے کبھی رازِ خوشی
گرجتے ابر میں اکثر ہے سنی
ہم نے ہلکی سی بہاروں کی ہنسی

☆☆☆

نوجوانوں کو ہدایت

وقتِ آشوب ہے، عنقا ہے یہاں امن وسکوں
ہر طرف جنگ و جدل سازش وعصیاں و عناد
آگے بڑھتی ہوئی امواجِ سیاہ و سفاک
پسپا ہوتی ہوئی اس قوم کی فوجیں برباد

بستیاں بستی ہیں اور بس کے اجڑ جاتی ہیں
قسمتیں قوم کی دم بھر میں بگڑ جاتی ہیں

سمجھو اسباب ترقی و روایات زوال
دیکھو تاریخ کے ساحل پہ رواں مدّ وجزر
وقت دیتا ہی نہیں احقر و کمزور کا ساتھ
عیش وعشرت میں قلعہ دار ہوئے ہیں بے گھر

ذہن کابل پہ غلامی کی ہے زنجیر کسی
اس لیے اہل وطن قوم کی بستی نہ رہی

☆☆☆☆☆

نوجوانوں سے خطاب

غیر کی بستی میں دیکھو، اجنبی رسم و رواج
نوجوانوں قوم کے، بھولو نہیں اپنا سماج
اب نہیں اپنی حکومت اب نہیں اپنا وہ راج
موڑ پر آ کر کھڑے ہیں، فیصلہ کرنا ہے آج

منتشر حالات میں، اپنی نہ قدریں بھولنا
اپنی تہذیب و ادب کے ساتھ پھلنا پھولنا

بڑھ کے آگے تھام لو تم قوم و ملّت کا علم
ہو محافظ تم ہی اُسکے، رکھنا مذہب کا بھرم
ہو سپاہی تم جری، رکھنا ہے مستحکم قدم
قاہر و سفاک نے گھیرا ہے پھر اپنا حرم

ملّتِ اسلام کی عزت تمہارے ہاتھ ہے
ہر قدم پر مشکلوں کا، دشمنوں کا ساتھ ہے

قوم کے سر پر عدو کی تیغ ہے اب بے نیام
ہر طرف مسلم کا دُنیا میں ہوا جینا حرام
اپنی نادانی سے خود ہی ہوگئے ہیں تشنہ کام
نیک ہیں بدنام، غاصب ہوگئے ہیں نیک نام

'لا الٰہ' کہنے والوں کا خُدا خاموش ہے
اُمتِ احمدؐ کی قسمت کس لئے غم کوش ہے

ہم کو دنیا میں ہے رہنا، مصلحت سے کام لو
جائزہ حالات کا لو، متحد آگے بڑھو
اپنی کمزوری کو سمجھو اور عدو کی چال کو
راستے میں جب ہو خطرہ، راہ اپنی موڑ دو

ہے اَمر واجب تحفظ کے لئے جنگ و جدل
مصلحت اور دور بینی کا نہیں کوئی بدل

ترکِ مشرب کی ہے دعوت ہر طرف ہے ناؤ نوش
گو قوی دشمن ہے، اُسکی روح ہے ظلمت بدوش
لاکھ شیطاں ضد کرے، ہونا نہ تم شعلہ بگوش
صحبتِ عاصی میں بھی قائم رہے ایماں کا ہوش

اپنا دامن پاک رکھو ہے بہت فسق و فجور
ورنہ راہِ نیک سے کچھ اور ہو جاؤ گے دُور

علم کی راہوں پہ حق کی منزلوں کو پاؤ گے
ہو اگر کاوش تو خود ہی مکتفی ہو جاؤ گے
تم مُنظّم ہو کے راہِ ارتقا کو پاؤ گے
جو نہیں محتاج ہو گے، تو غنی کہلاؤ گے

قوم ہے سوئی ہوئی اُسکو جگانا فرض ہے
ہاں اگر سُننا ہے تم کو تو مری یہ عرض ہے

کس طرح تم کو بتاؤں کس قدر مشکل ہے راہ
ہر کوئی اپنے مناد و مال میں کھویا ہے آہ!

☆☆☆

آزادی کا راستہ

اگر آزاد ہونا چاہتے ہو تم حقیقت میں
تو اپنی سوچ، محکومی کا کالا رنگ بدل ڈالو
تجارت میں نہ دھوکا دو کہ آسودہ نہیں ہوں گے
دغا دینے کا اپنوں کو پرانا ڈھنگ بدل ڈالو

دغا دیتے ہیں جو اپنوں کو وہ برباد رہتے ہیں
جو ہوتے متحد آپس میں ہیں آزاد رہتے ہیں

غیر کی تقلید

نہ منزلوں کا پتہ ہے نہ راستہ معلوم
یہ کیسے دشت میں پھرتا ہے قافلہ معدوم

ہمیشہ دست نگر ہم رہے زمانے کے
بکھرتے کیسے نہ تنکے اس آشیانے کے

بڑے ہی شوق سے کرتے ہیں غیر کی تقلید
جو میری قوم کو احساس کمتری ہے شدید

کشمیری مجاہد کی کہانی، اسکی زبانی

پسِ منظر:۔ ایک وادی سے گزر رہا تھا جو دیکھا دُور، ایک چٹان کے قریب، درخت سے ٹیکا لگائے، ایک نوجوان بیٹھا ہے۔ پرانی سی بندوق پہلو میں رکھی ہوئی ہے۔ قریب سے دیکھا تو نوجوان کی آنکھیں بند تھیں اور کپڑے خون میں بھرے ہوئے تھے۔ اسکی روح کب کی پرواز کر چکی تھی۔ شام ڈھلی تو مجھے دُور سے آواز آئی، جیسے کوئی دھیمے سُروں میں نوحہ خواں ہو۔

مجاہد کا نغمہ

میں بھی کسی کا پیار تھا، میں بھی کسی کی آرزو
میں بھی کسی کا راز تھا، میں بھی کسی کی آبرو

میرے لئے سنگھار تھا، میرے لئے تھا پیرہن
شرم و حیا کی تھی ادا، میرے لئے تھا گُل بدن

میں بھی یقینِ عشق تھا، میں بھی کسی کا اعتبار
میرا تھا کوئی منتظر، مجھ کو کسی کا انتظار

میں تھا کسی کا جانِ من، مجھ سے کسی کو تھی ثبات
میں اُسکی کائنات تھا اور وہ تھا میری کائنات

تھا باپ کا نُورِ نظر اور ماں کا تھا میں اپنی لال
بہنوں سے تھیں محبتیں، گھر کا تھا میں ہی نونہال

میں بھی تھا جوشِ بے اماں، میں بھی تھا موجِ زندگی
میں بھی سرورِ عشق تھا، میں بھی تھا اوجِ زندگی

تھے جو قریبِ جاں مرے، اُن کو خدا پہ چھوڑ کر
راہِ فنا پہ ہولیا، منہ کو میں اپنے موڑ کر

منزل پہ اپنی موت کی مجھکو نہ کوئی غم رہا
جن کا میں نُورِ عین تھا، اُن کو ہی غم میں دے گیا

آزاد ہو میرا وطن، دی جاں وطن کے واسطے
آباد کر دے اے خدا، اس خونِ تن کے واسطے

ف فکر و فن سے ہے مزین جو جبیں
مائلِ سودوزیاں ہوتی نہیں

ر رہنمائی کی، قلم قرطاس نے
پائی منزل آپ کے احساس نے

ا ابرِ احساسات کی چھاگل کھلی
ارضِ فکرِ نو بھی جل تھل ہو گئی

م مہک اٹھے آرزوؤں کے گلاب
خوشبوئیں چاروں طرف پھیلیں شتاب

ی یوں بھری ہے مانگ نظموں کی سدا
آپ نے ان کو سہاگن کر دیا

ر رنگ لالہ کو لہو دل کا دیا
گلشنِ افکار تازہ ہو گیا

کون ہے یہ زلفِ اردو کا اسیر
نامِ نامی آپ کا جعفر امیرؔ

تاثرات از حادثہ ۱۱۔ ستمبر ۲۰۰۱ء

حسیں تھا آشیاں اپنا، مگر اُسکو جلا بیٹھے
ہمیں خود بن گئے رہزن، خود ہی کو ہم لُٹا بیٹھے

طبیعت کی کجی، خود اپنی بربادی پہ مائل تھی
زمین و آسماں اپنا تھا، لیکن سب مٹا بیٹھے

نہ سمجھے آہ، کارِ دو جہاں ہم عیش و عشرت میں
ہوا یہ بعد کو معلوم، ہم کیا گُل کھلا بیٹھے

یہاں الزام اپنے سر خطا کا کون لیتا ہے
عدُو پر تہمتِ بربادیٔ گلشن لگا بیٹھے

نہ سمجھے معنیٔ قرآں، نہ ہی تاریخ سے سیکھا
جو مذہب سب سے اعلیٰ ہے، اُسے ہم کیا بنا بیٹھے

ہوئے مسکین ایسے، کھو دیا احساسِ خودداری
سرِ تسلیم آگے دشمنوں کے ہم جُھکا بیٹھے

ضرورت جب ہوئی تیغ و تبر کی خانہ جنگی میں
تو دستِ مدعا پیشِ مُنافق ہم اُٹھا بیٹھے

جو لاشیں ہم نے دیکھیں خونچکاں وہ نوجوانوں کی
کبھی ماتم کیا ہم نے کبھی آنسو بہا بیٹھے

مشیت ہے یہ یزداں کی، یہی قسمت میں لکھا ہے
نمازِ میّتِ معصوم پر یہ کر دُعا بیٹھے

جہادِ حق میں ہم پر ہیں اصولِ مصطفےٰ لازم
لہو معصوم کا کیوں اپنے دامن پر لگا بیٹھے

تدبر بہ عمل میں ہو، کہ نقصاں ہو نہیں اپنا
مہم میں چاہئے ہے، یہاں ذلت اٹھا بیٹھے

کہاں ہے ذوالفقارِ احمدیؐ، ہو تم کہاں حیدر
مدینے کے جوارِ پاک میں دشمن ہیں آ بیٹھے

امیرؔ اپنی عبث نوحہ گری ہے جانتے ہیں ہم
رگِ جاں سے جو نکلا خون کاغذ پر بہا بیٹھے

☆☆☆

قطعہ

خبر سُنی ہے کہ پھر قتلِ مومنیں ہے رواں
جنونِ ظلم و تشدد کا ہر طرف ہے دُھواں
بندھے ہیں ہاتھ، پڑی پاؤں میں ہیں زنجیریں
بسانے مغربی زنداں کو اب چلے ہیں جواں

☆☆☆

دارفور۔ افریقہ

نوٹ :۔ دارفور، سوڈان میں افریقی باشندوں پر ظلم، اسلامی حکومتوں کی بے حسی اور مسلمانوں کے ایمان کی پستی کے خلاف۔

نہ تو دیں رہا، نہ شعورِ دیں، نہ بلال کی رہی اب صدا
نہ تو ذوالفقار عدو شکن، نہ جہادِ مومنِ کربلا

ہے دھواں، دھواں سوئے آسماں، ہے فضا میں سرخیٔ منطقی
میرا کعبہ ہی کہیں وہ نہ ہو، جو عدو کی آگ سے جل رہا

میری قوم خستہ و خوار ہے، اے خدا نہیں کوئی چارہ گر
تیرے وعدے پہ یقیں کیا کروں کہ یقین دل سے ہے اُٹھ گیا

نہ ہیں متحد، نہ ہیں ہمکناں، نہ ہے اجتہادِ عمل کوئی
نہ تو رخ رہا، نہ ہی راستہ، نہ ہے منزلوں کا کوئی پتہ

نہ اصولِ دیں پہ عمل ھے اب، نہ تو دل ہوا دلِ مومنیں
نہ تو سچ رہا، نہ تو جھوٹ ھے، جو ہے منقلب وہ ہی سربرا

جو نظر میں ہے سرِ آئینہ، وہ نہ نقش ہے پسِ آئینہ
کہے منہ پہ کچھ رہے دل میں کچھ، یہ نفار کیوں، یہ فریب ہے کیا

کیوں ہے دارفور میں قتل وخوں، کیوں زنا وشر سرِ عام ہے
کیوں یہ ظلم خیل بلالؓ پر، میرے مصطفیٰؐ مجھے تو بتا

☆☆☆

قطعہ

زمین پاک کو ناپاک کر دیا ہم نے
نظامِ دین تہہ خاک کر دیا ہم نے
بنایا جو تھا وطن مصطفےٰؐ کے آئیں پر
اُسی وطن کو المناک کر دیا ہم نے

☆☆☆

دُعا

یا رب میں دعا کرتا ہوں تو مجھ کو جزا دے
بدکار جو انسان ہیں تو ان سے بچا دے

شیطاں سے بچا دے مجھے، آفات جہاں سے
گمراہوں کی صحبت سے، گناہوں سے بچا دے

یا رب میں دعا کرتا ہوں تو مجھ کو جزا دے

خدمت میں غریبوں کی سدا کرتا رہوں گا
توفیقِ عمل دے تو مجھے دستِ شفا دے

دے مال کہ بن جاؤں یتیموں کا سہارا
نسبت سے میری بھوکوں کو تو کھانا کھلا دے

یا رب میں دعا کرتا ہوں تو مجھ کو جزا دے

نُکتۂ قرآن

نوٹ :۔ میرے ایک عزیز دوست جو مسجد کے امام بھی تھے، اپنی بیگم کو پاکستان نہیں جانے دیتے تھے۔ آٹھ دس سال گزر گئے یہاں تک کہ بیوی کے والد بیمار پڑ گئے۔ لوگوں نے مجھ سے درخواست کی کہ آپ اپنے دوست کو سمجھائیں۔ دُو بہ دُو اس سلسلے میں بات کرنا مناسب نہیں تھا، سو یہ نظم لکھ کے اُن کو سُنائی۔ شاید اُس کا اثر تھا کہ شیخ صاحب نے بیوی کو میکے جانے کی اجازت دے دی۔

میں دِل کا کعبہ لئے تھا آگے
اصولِ دیں کو وہ آگے لائے

نہ اُس کی باتیں سمجھ سکا میں
نہ میری منطق سمجھ وہ پائے

کہا جو میں نے اُو شیخ میرے
کہ جانِ قرآں یہی تو دل ہے

اسی سے رفعت ہے آدمی کو
اگر نہ ہو یہ، وہ مبتذل ہے

شعورِ سجدہ نہیں ہے مجھ کو
مگر میں اتنا تو جانتا ہوں

کہ دل دُکھایا تو کعبہ ڈھایا
یہی ہے مذہب جو مانتا ہوں

کسی کی سسکی سُنی تو ہوگی
کسی کا رونا سنا تو ہوگا

شفائے غم سے بقاء انساں
کہیں یہ آخر پڑھا تو ہوگا

میں دل کی باتیں جو کہہ رہا تھا
دلیل سُنّت ہزار لایا

نہ اسکی باتیں سمجھ سکا میں
نہ میری منطق سمجھ وہ پایا

اَہنسا کے پُجاری

(ہندوستان کی اکثریت سے خطاب)

نوٹ:۔ حیدرآباد پر ۱۳؍ستمبر ۱۹۴۸ء میں پولیس ایکشن کے نام سے فوجی حملہ کیا جس میں ایک لاکھ مسلمانوں کا قتلِ عام کیا گیا تھا۔ اسی طرح آسام میں بھی مسلمانوں کا قتلِ عام کیا گیا اور کوئی مجرم گرفتار نہ ہوا۔

ہولی ہے خوں کی، ہاتھ رنگے جا رہے ہو تم
سُرخی لگا کے خوں کی، اُڑے جا رہے ہو تم

کمزور پر جو حملے کئے جا رہے ہو تم
گیدڑ ہو، اور شیر بنے جا رہے ہو تم

کثرت پہ اپنی ناز کئے جا رہے ہو تم
کیوں بے کسوں پہ ظلم وستم ڈھا رہے ہو تم

کیوں اقلیت پہ ظلم کئے جا رہے ہو تم
الزامِ بے وفائی دیئے جا رہے ہو تم

عہدے، نہ نوکری، نہ کوئی منصب و معاش
اس پر یہ قتلِ عام کئے جا رہے ہو تم

پہلے ہریجنوں کو نشانہ بنا چکے
اب بے بسوں پہ جور کئے جا رہے ہو تم

چشمہ لگا کے آنکھ پہ دنیا کے واسطے
مُردوں کو دیکھنے کو چلے جا رہے ہو تم

برباد اور ہوگئے، آزاد ہو کے ہم
آزاد ہو کے ظلم کئے جا رہے ہو تم

دیتے ہو قتلِ عام کو سُرخی فساد کی
مکر و فریب کب سے کئے جا رہے ہو تم

بہ رنگِ دِگر

نظمیات

نفس میں نظموں کی خوشبو، بدن میں کُفرِ شباب
ہے جلوہ گر میرے نغموں میں ریختی کا سراب

"مجبور ہوں میں حال پہ قابو نہیں رہا"
یہ عذرِ لنگ خوب کئے جا رہے ہو تم

"افسوس ہے کچھ ایسا نہیں ہونا چاہیے"
مظلوم سے بس اتنا کیے جا رہے ہو تم

کیا خوب تم کو مجرم و قاتل نہیں ملے
جھوٹی تلاش کب سے کئے جا رہے ہو تم

ہر خون کا جواز ہے، ہر حادثے کے بعد
ہٹلر کے راستے پہ چلے جا رہے ہو تم

آئینِ مُلک اور، تمہارا عمل ہے اور
دنیا کو خوب دھوکا دیئے جا رہے ہو تم

پوچھے کوئی یہ دین اہنسا کے نام پر
خوں ریزیاں یہ کیسی کئے جا رہے ہو تم

☆☆☆

خدا سے سوال

منطقِ زیست نہیں، محشرِ دوراں کیوں ہے
اے فلک تیرا جہاں، محرمِ حرماں کیوں ہے
جو ہے معصوم، بتا، وہ ہی پریشاں کیوں ہے؟
کوئی پوچھے گا نہیں تجھ سے کہ یزداں کیوں ہے

جس طرف دیکھئے اک ظلم کی دارائی ہے
جو ہے کمزور اُسی کی یہاں رُسوائی ہے

ظالموں کا یہ ستم، شامِ غریباں کیوں ہے
راہِ مومن پہ بچھا، خارِ مغیلاں کیوں ہے
متقی بھی تری دنیا میں پریشاں کیوں ہے
کافروں پر تری رحمت، تیرا احساں کیوں ہے

یہ تماشا نہیں دنیا کا سمجھ میں آتا
تیرے انصاف کا میزان ذرا سمجھاتا

کہیں افراط، کہیں قحط ہے، ایسا کیوں ہے
بھوکے بچوں کا سسکنا یہ خدایا کیوں ہے
ہاتھ پھیلائے یتیموں کا یہ گریہ کیوں ہے
اس سے بہتر کسی دنیا کا نہ ہونا کیوں ہے

رنج وغم، شوق سے کچھ اور بھی میں سہہ لیتا
تو جواب میرے سوالوں کا اگر دے دیتا

☆☆☆

قطعہ

اے رسولؐ پاک پھر سے کربلا برپا ہوا
پھر طبل جنگ وجدل کے ہر طرف ہیں گونجتے
پھر سے معصوموں کے خونِ پاک سے بھیگی زمیں
پھر سے شمشیریں لئے دشمن یہاں ہیں گھومتے

(عراق کی جنگ سے متاثر ہوکر)

☆☆☆

خطائے نظر

کہا یہ رب سے، چھپا تجھ سے کوئی راز نہیں
مرا سوال بھی تجھ سے بلا جواز نہیں
گُنہ ہے دیکھنا اندازِ حُسنِ نامحرم
کریں کیا، پھر بھی نظر دیکھنے سے باز نہیں

خدا نے دیکھ کے حیران مجھ کو سمجھایا
کہ نیک و بد میں کوئی تجھ کو امتیاز نہیں
چمن میں دیکھ، بہاراں کار ساز نہیں!
تیری ہی دید کو کھلتے ہیں گل، یہ راز نہیں

شبابِ حسن کا اُٹھتا ہوا ہے پیچ و خم
جہاں نشیب کو دیکھا، وہاں فراز نہیں!
کھلیں جو پھول تو بادِ شمیم چلتی ہے
مشامِ عموم کو ایسا کوئی مجاز نہیں

چمن کو دیکھ، ابھی شیخ کو تو جانے دے
شباب رنگ بہاراں کو کیا گداز نہیں!

منقبت

مسدّس

حُسنِ قدرت سے خُدائی کی جلالت کا ثبوت
حرفِ قرآن سے محمدؐ کی نبوّت کا ثبوت
علمِ تفسیر سے حیدرؑ کی امامت کا ثبوت
فوجِ شبیرؑ کی صحرا میں شجاعت کا ثبوت

میری تحقیق و تجسّس کے لئے کافی ہے
معتقد جو نہ دلائل کا ہو، اتلافی ہے

نوحہ

فتنہ گروں نے پیاسے مسلماں کو جالیا
آلِ نبیؐ کے سید و سیداں کو جالیا

خیمے جلے تو آگ سے کچھ روشنی ہوئی
پھر تارِ شب نے شامِ غریباں کو جالیا

سر کٹ گیا پہ خم نہ ہوا زورِ تیغ سے
الِ مومنیں نے فتنۂ شیطاں کو جالیا

یادِ خُدا میں بھولے نہ خدمت وہ خلق کی
چارہ گری میں دردِ فقیراں کو جالیا

مرگِ حُسینؑ، مرگِ یزیدانِ کربلا
ابنِ علیؑ نے غیرتِ دوراں کو جالیا

وہ واردات خون کی، قرآں کی شرح تھی
خونِ نبیؐ نے دشمنِ ایماں کو جالیا

قابو رہا نہ دل پہ مرے، حُسن کے داستاں
خونِ جگر نے سرحدِ مژگاں کو جالیا

☆☆☆

قطعہ

قرآن بن گیا تھا ہر زندگی کا پہلو
درسِ علیؑ میں پنہاں تھا خود نبیؐ کا پہلو
میدانِ کربلا میں شبیرؑ نے بتایا
ایمان اور یقیں کی آسودگی کا پہلو

قطعہ

آکر خدا نے خواب میں پوچھا حُسینؑ سے
بتلا کہ تیری زیست کا مقصد بھلا ہے کیا؟
اُمت کو اپنے نانا کی دیکھا حُسینؑ نے
سر کو جُھکا کے کہنے لگے، کربلا ہے کیا؟

قطعہ

آدم آئے تو کبھی خضر و سلیماں آئے
موسیٰ، عیسیٰ، کبھی صاحبِ قرآں آئے
پھر بھی آیا نہیں اس اُمتِ آدم کو شعور
آئے حیوان کی صورت میں تو انساں آئے

غزلیات

دل کی تڑپ نے ہمکو غزل خواں بنا دیا
انشاء کا شوق ورنہ ہمیں کیا ضرور تھا

جلوہ گستر

جلوہ گستر ہے نگاہ وقلب پر اُس کا جمال
ڈھونڈتا ہے ساحلِ قرطاس کو سیلِ خیال
ہے قلم کی نوک پر تخلیق کا اک ارتعاش
اور عبارت کی قبا میں ریشمی لفظوں کا جال

۱۔ غزل

دیوانگی نے پھر دلِ ناداں کو جالیا
دامن جو نہ رہا تو گریباں کو جالیا

اک دل لگی میں صحبتِ خوباں کو جالیا
بُلبُل نے شوقِ گُل میں گلستاں کو جالیا

آسودگی میں پایا نہیں دل کا جب سکوں
بن کے فقیر دشت و بیاباں کو جالیا

قابو رہا نہ دل پہ دمِ رُخصتی مجھے
خونِ جگر نے دامنِ مژگاں کو جالیا

لیتے ہو کیا حساب گناہوں کا اب نکیر
صدقِ دُعا نے رحمتِ یزداں کو جالیا

آنکھوں میں میری نیند نہ آئی شبِ فراق
فُرقت نے میری صبحِ پشیماں کو جالیا

کتاب : بہ رنگِ دگر

مصنف : سید جعفر امیر

اشاعت : ۲۰۰۶ء - ۲۰۱۰ء

قیمت : ۴۰۰ روپے

تعداد : ۵۰۰

کمپوزنگ : رمیض الحسن سرینگر کشمیر

سرورق : محمد امتیاز الرحمن ممتاز حیدر آباد

مطبع : ایچ۔ ایس آفسیٹ پرنٹرس نئی دہلی۔۲

زیر اہتمام : ڈاکٹر شاہد حسین نئی دہلی، 9868572724

ISBN-13 : 978-93-80279-12-1

حق اشاعت [illegible] — مصنف سید جعفر امیر [illegible]
[illegible] محفوظ ہیں (رابطہ sjamir@gmail.com)۔ اس کتاب کی کوئی نقل
[illegible] کسی بھی شکل میں اور کسی بھی ذریعے سے ترسیل
کی اجازت نہیں ہے سوائے مصنف کی تحریری اجازت کے۔

DISTRIBUTORS:

Syed J. Amir
2118 Frissell Ave
Apex, NC 27502-9069
USA Phone No. 001 919-363-0687

Dr. Shahid Husain
Shahid Publications 2253 Resham Street
Kucha Chelan Darya Ganj, New Delhi-2 INDIA
Ph. 011-[illegible] M. [illegible]
Email: [illegible]

نظمیات:

جمالیات

اگر نہ عشق کی منزل سے زندگی گزرے
سفر سے عمر کے کس طرح آدمی گزرے

☆☆☆☆☆

کوئی حیات نہیں عشق کی حیات کے بعد
کوئی مقام نہیں دل کی کائنات کے بعد
نظر اٹھی نہ کسی پر بھی دیکھ کر تجھ کو
جچی نہ بات کسی کی بھی تیری بات کے بعد

آیا نہ راس جب کہ ہمیں کاسہ و گلیم
بڑھ کر ہوس نے گنجِ گریزاں کو جالیا

تزئینِ شعر میں جو تھا مفہومِ رازِ دل
نغموں نے میرے خاطرِ خُوباں کو جالیا

ساحل کے جب سکوت سے اُکتا گیا امیرؔ
اُٹھا اور اُٹھ کے شورشِ طوفاں کو جالیا

☆☆☆

ابیات

اُو چھوٹے سے خوش رنگ، تُرئی کے پھول
تیری پیلاہٹ سے ہیں آنکھیں پُر نور

☆☆☆

بارِ خاطر ہوگا اُس پر، اُس سے شکوہ کیا کروں
آہ دل کی اک شکایت بن کے لب پر آ گئی

☆☆☆

۲۔ غزل

بہت اب تھک گیا ہوں انتشارِ زندگانی سے
امیدِ وعدۂ فردا سے شوقِ شادمانی سے

عجب یہ دوستی کا رنگ دیکھا ہم نے دنیا میں
سُنا میرا کہا مشکل ہے، وہ بھی بدگمانی سے

سیہ ہے پیرہن ہر لفظ کا تحریر میں میری
قلم کی نوک پر سُرخی جو ہے گریاں بیانی سے

ہُوا اچھا چبھے جو خار، یہ تو کہہ سکوں گا میں
نہیں آیا ہوں خالی ہاتھ فصلِ گلفشانی سے

سن نوخیز ہے، خندہ جبیں، آنکھوں میں مستی ہے
نکھر جیسے کنول کھلتا ہے رنگِ ارغوانی سے

یہی باتوں ہی باتوں میں بیاں کچھ آ گیا اُس کا
فسانہ بن گیا یہ کس طرح قصہ کہانی سے

خفا ہوتے ہو، ہو لو، قتل کرنا ہے، تو کر ڈالو
مگر میری وفا کو یوں نہ دیکھو بدگمانی سے

اُدھر سننے کی حسرت اور ادھر تھا شوق گویائی
مری جب داستاں ٹکرا گئی اُس کی جوانی سے

نہاں رکھنا ہے مشکل دردِ دل، آنسو کو کیا کیجئے
گھٹن سی ہے گھٹن اس بندشِ دردِ نہانی سے

خروشِ عشق میں سر رکھ دیا جو اُس کے قدموں میں
جھٹک کر بڑھ گیا ظالم وہ میری زندگانی سے

۳۔ غزل

دھواں سا عود کا، زلف دراز لہرائی
جبینِ ناز پہ کاکل کی اک گھٹا چھائی

دھنک ہو نورِ تجلی سے جیسے گھونگھٹ میں
سراب ہے کہ سرِ آئینہ ہے پرچھائی

خود ہی سنگھار کی زینت وہ بن گیا ظالم
عروسِ خلد کی جلوہ نما ہے زیبائی

حنا کی دستِ سحر پر ہے سرخ گل کاری
وہ پائے سیمیں پہ پازیب کی ہے پیرائی

کلی انار کی جیسے سحر کے دامن میں
چٹک رہی ہے جو کم کم چمن میں شرمائی

ہوا ہے عقدہ کشا سرمہ اس کی آنکھوں کا
شمع کے جلنے کی اب بات کچھ سمجھ آئی

ادائے شرمِ جنوں ساز نے بصد انداز
نگاہِ شوق کی کچھ اور آگ بھڑکائی

صبا بدوش ہے وہ سرو قد وہ زہرہ جبیں
میں اُسکے حُسن مکمل کا اک تمنائی

یہ ارمغانِ حسیں دے کرا ے رحیم و کریم
ہر ایک دُعا کی مری تو نے کی پذیرائی

فلک پہ نور سا پھیلا ہے اُس کے آنے سے
امیر دل میں مرے بج رہی ہے شہنائی

☆☆☆

۴۔ غزل

نہ دن اپنا، نہ شب اپنی، نہ دل اپنا، نہ جاں اپنی
اسی انداز سے کاٹی ہے یہ عمرِ رواں اپنی

وہ اُس کی چشمِ آہو کو جو دیکھا سُرمہ سا میں نے
سکوں کھویا، خرد کھوئی، وہ طرزِ رندگاں اپنی

رُخِ گلنار پر خالِ سیہ اس کا وہ تابندہ
وہ اک تصویرِ جادو اور نگاہِ ناتواں اپنی

کبھی مختار تھا حالات پر تابع تھی قسمت بھی
ادھر تو سب ہی یہ ہے کہ نہ اپنی، نہ ہاں اپنی

پتہ کیا پوچھتے ہو، پوچھتے ہو حال کیا مجھ سے
بسا ہوں، جس زمیں پر، وہ ہے بستی لامکاں اپنی

جھکائی تھیں جو اُس نے، دیکھ کے وہ شرگیں آنکھیں
وہیں سے کیا ہوئی تھی ابتدائے داستاں اپنی

مرے اشعار میں پوشیدہ ہیں صد رنگِ رومانی
امیرؔ اب غور سے تم بھی سُنو شیریں زباں اپنی

☆☆☆

ابیات

دیکھیں ہمارے دل کی تڑپ، شوق وصل کو
ہم پوچھتے ہیں ان سے کہ آئیں گے پھر وہ کب!

☆☆☆

خُمار و خُم سے نہیں اب نشاط و بیہوشی
اٹھا لو مینا و ساغر کو میرے آگے سے

☆☆☆

۵۔ غزل

اِس دل کی تڑپ اور ہے، آنکھوں کی طلب اور
اُڑتی ہوئی زُلفوں کا بکھرنا ہے غضب اور

قاتل تیرے ہاتھوں سے فنا ہونے کی ضد ہے
ورنہ ہمیں آتا ہے خداؤں کا ادب اور

جیتے ہیں اُسی کے لئے مرتے ہیں اُسی پر
جینے کا سبب اور ہے، مرنے کا سبب اور

آئے گا سلیقہ نہیں جینے کا بشر کو
چلتا ہی رہے گا یہ زمانے کا شغب اور

ہے میرے لئے نیک جو، وہ اُس کے لئے بد
ہے میرا خدا اور، تو ہے اُس کا بھی رب اور

ہیں آس لگائے کہ کرم ہم پہ بھی ہوگا
حسرت میں گزر جائے نہ یہ آج کی شب اور

کھاتے ہو ترس خود پہ، ذرا یہ بھی تو دیکھو
قسمت کے ہیں مارے ہوئے کچھ جان بلب اور

اب نیند امیرؔ آنے لگی، وقتِ سحر ہے
کہنے کو مرے پاس کہانی نہیں اب اور

☆☆☆

بیت

حدّتِ درد سے آخر نہ رہا خونِ جگر
چشمِ گریاں سے جو بہتا تھا لہو، سُوکھ گیا

☆☆☆

۶۔ غزل

وقتِ رخصت ہائے اُن کی بے زبانی یاد ہے
جو اَدھوری رہ گئی تھی وہ کہانی یاد ہے

اشتیاقِ وصل میں وہ ان کا آنا دوڑ کر
ہاتھ آنکھوں پر وہ رکھنا، ناگہانی یاد ہے

زندگی میں تیرا آنا دو گھڑی کے واسطے
آج بھی وہ پُرسکوں سی شادمانی یاد ہے

پُھول لانا نامہ بر کا میرے رقعے کا جواب
یہ ہے فصلِ بہاراں کی نشانی یاد ہے

جب در و دیوار کو دیکھا ترے جانے کے بعد
ہر در و دیوار پر تیری نشانی یاد ہے

خوابِ سحر

عمل تھا آخرِ شب، ذہن پہ تھی غفلتِ خواب
تہہ شعور کی دنیا کے جلوہ گر تھے سراب

سنہرہ رنگ لئے تھی فِضا کُہر آلود
ذہن میں پھولوں کے روغن کا اٹھ رہا تھا عُود

نقوش اُنکے ابھرتے تھے، جھلملاتے تھے
کبھی وہ آتے تھے، جاتے تھے، مسکراتے تھے

شعورِ نوم میں ابھرے ہوئے تھے نقش و نگار
کُہر کی آڑ میں جیسے کہ ماہ کا دیدار

فلک پہ جیسے بجاتا ہو کوئی چنگ و رباب
ہاں اُسکی نغمہ سرائی کی گر رہی تھی شراب

نشاط ساز سے مخمور تھا کہ آئی صدا
امیرؔ، اُٹھ کہ حقیقت کو دیکھ تو بھی ذرا

اب تو میں ہوں اور میرے عشق کی تنہائیاں
وصل کا موسم، وہ فصلِ نوجوانی یاد ہے

روکنے کی دل میں خواہش بے بسی حالات کی
مُدعا دل میں مگر وہ بے زبانی یاد ہے

ہوک سی اُٹھتی تھی دل میں وہ ترے جانے کے وقت
وہ ترے آنے کی سچی شادمانی یاد ہے

☆☆☆

ابیات

چمن میں، دشت میں، صحرا میں، شہر و بستی میں
سکونِ دل کے لئے میں کہاں کہاں نہ گیا

☆☆☆

ایک آزار سا آزار ہے عمرِ پیری
دردِ دل رہتا ہے بس عبرتِ ہستی کے سبب

☆☆☆

امیرؔ دیکھو نہ ماضی کو ایسے مڑ مڑ کر
گزر گیا جو زمانہ اُسے نہ یاد کرو

☆☆☆

۷۔ غزل

کب سے ترے خیال میں ڈوبا ہوا ہوں میں
کب سے ترے فراق کا مارا ہوا ہوں میں

چھوڑا تھا رہ گزر پہ جہاں تو نے میرا ساتھ
اس رہ گزر پہ آج بھی بیٹھا ہوا ہوں میں

کب سے ہیں بند مجھ پہ ترے دل کے راستے
کب سے ترے فریب میں آیا ہوا ہوں میں

صبحِ فراق آ! کہ بہت دیر ہو چکی
طولِ شبِ فراق کا رویا ہوا ہوں میں

''آہستہ برگ گل بہ فشاں بر مزارِ ما''
آیا ہوں کچھ ہی دیر کا سویا ہوا ہوں میں

زندانِ زندگی میں بسر ہو رہی ہے خوب
اک جُرمِ عشقِ یار کا مارا ہوا ہوں میں

کوئی صدائے پا نہ کسی سانس کی مہک
اٹھتی ہوئی بہار میں تنہا ہوا ہوں میں

کہتے ہیں بزمِ زیست میں آئے ہو کیوں امیرؔ
آیا نہیں ہوں وقت کا لایا ہوا ہوں میں

☆☆☆

ابیات

شعلۂ عشق کو دوبارہ ہوا دو نہ امیرؔ
خاک میں خُفتہ بسر رہنے دو چنگاری کو

☆☆☆

میرے بچوں نے بڑی چاہت سے کچھ تحفے دیے
شرم لیکن اپنے سن کو دیکھ کر آنے لگی

☆☆☆

۸۔ غزل

وعدہ جو کیا تھا وہ نبھایا نہیں جاتا
اب جور و ستم اُس کا اُٹھایا نہیں جاتا

لپٹی ہوئی منڈوے سے چنبیلی کی ہیں شاخیں
یادوں کے گلستاں کو اُجاڑا نہیں جاتا

بے وقت کی فرقت میں نہیں لوٹ کے آنا
ڈھلتے ہوئے سورج کو اُبھارا نہیں جاتا

شرما کے شرم سار نگاہوں کا جھکانا
آغازِ محبت کو بھلایا نہیں جاتا

ہوتا ہے تعارف وہ مکمل کہاں جس میں
تصویر کے ہر رُخ کو دکھایا نہیں جاتا

اس دہشتِ حالاتِ زمانے کو کریں کیا!
سفاکیِ زمانے کو سکھایا نہیں جاتا

اندازِ تغافل کو روا رکھتے کہاں تک
آندھی میں چراغوں کو جلایا نہیں جاتا

نکلے جو وطن سے تو بھٹکتے ہی رہے ہم
پردیس میں گھر اپنا بسایا نہیں جاتا

کوئی تو بہانا ہو، کوئی بہر ملاقات
دعوت کے بنا ہم سے تو جایا نہیں جاتا

ہے آگ مرے دل میں محبت کی فروزاں
بھڑکے ہوئے شعلوں کو بُجھایا نہیں جاتا

رکھنا ہے بھرم عزتِ فُقرا کا امیرؔ اب
کشکولِ طلب آگے بڑھایا نہیں جاتا

امواجِ حوادث ہیں مُصر میری فنا پر
منجھدار میں کشتی کو سنبھالا نہیں جاتا

یہ پند و صلاح گوش پہ ناداں کی گراں ہے
بدخوئے زمانے کو سکھایا نہیں جاتا

☆☆☆

ابیات

تم نے جو گیت گائے تھے میرے لیے کبھی
اس وادیٔ حیات میں وہ گونجتے رہے

☆☆☆

وہ بھی بدل گئے، ادھر ہم بھی بدل گئے
اس گردشِ حیات نے چھوڑا کسی کو کب

☆☆☆

۹۔ غزل

وہ جوانی نہ رہی، اب وہ زمانے نہ رہے
عہدِ ہنگامِ محبت کے فسانے نہ رہے

قدرِ ہستی تھی مجھے بہرِ عنایاتِ بتاں
وہ جو جینے کے بہانے تھے، بہانے نہ رہے

سازِ بربط کی نوا ہے نہ وہ آوازِ طرب
گُنگناتے تھے جنہیں اب وہ ترانے نہ رہے

وہ جو بیٹھے تھے گھڑی بھر کو مری محفل میں
تھے جو دو چار مرے یار و یگانے، نہ رہے

جذبۂ شوقِ سفر اپنی جگہ ہے لیکن
نہ سفینہ رہا کوئی، وہ ٹھکانے نہ رہے

خوشۂ عمر سے گرتے رہے ساعات گراں
خوشۂ عمر میں اب وقت کے دانے نہ رہے

کوئی کہتا تھا تعارف میں مری تربت پر
کوچۂ عشق کے سیّد، وہ دِوانے نہ رہے

☆☆☆

ابیات

امیرؔ دیکھو نہ ماضی کو ایسے مڑ مڑ کر
گزر گیا جو زمانہ، اُسے نہ یاد کرو

☆☆☆

ہر ابتدا کی ہوتی ہے آخر کو انتہا
ختم سفر ہو خیر سے، کرتے ہیں بس دعا

☆☆☆

۱۰۔ غزل

چمپئی رنگت ہے جیسے چاندنی چھائی ہوئی
ہائے وہ الہڑ جوانی موج پر آئی ہوئی

زُلف ہے یا عشق پیچاں پیچ و خم کھائی ہوئی
ہر ادائے دلبرانہ دل کو گرمائی ہوئی

کس سے سیکھا ہے لچکنا اس طرح سے شاخ نے
کس سے سیکھی ہے صبا یوں چال اٹھلائی ہوئی

روکنا ان کا مجھے ہر التجا سے پیش تر
اک سُلگتی سی تمنا دل کو تڑپائی ہوئی

شرم سے آنکھیں جھکی ہیں سرخ ہیں رُخسار بھی
ہاتھ میں ٹھنڈے پسینے روح گرمائی ہوئی

'ہاں' کبھی کہتے ہیں ہنس کر اور کبھی غصہ میں 'نا'
آپ کی باتیں یہی ہیں ہم کو اُلجھائی ہوئی

باندھ کے آئے تھے جُوڑا اور گئے گیسو بہ دُوش
بے ہوا سے زُلفِ پیچاں رُخ پہ لہرائی ہوئی

☆☆☆

ابیات

کامرانی چاہتی ہے حکمت و غور و عمل
اور حکمت تجربات نامرادی سے ملے

☆☆☆

گزر کے آگ سے لوہا ہو آہن شمشیر
ظفر کا راز نہاں شعلۂ شکست میں ہے

☆☆☆

کُھلی جو آنکھ تو اُسکی مہک تھی سانسوں میں
صبح کی دھوپ چمکتی تھی میری آنکھوں میں

☆☆☆

آخری ملاقات

کر کے سلام، سَر وہ جُھکا کر چلے گئے
جو ہمنوا تھے، اُن سے شناسائی رہ گئی

راز و نیاز کتنے تھے، اُلفت کے باب میں
اُلفت کی ایک موج تھی جو آ کے بہہ گئی

حالاتِ زندگی سے بدلتے ہیں لوگ سب
بادِ خزاں جو آئی تو، یہ مجھ سے کہہ گئی

☆☆☆

۱۱۔ غزل

انجامِ غم کی دل کو خبر کر چکے ہیں ہم
ہر امتحانِ عشق کو سر کر چکے ہیں ہم

اب باغباں سے ہم کو نہیں کوئی واسطہ
اب گوشۂ قفس میں سفر کر چکے ہیں ہم

اُن کو نہ راس آئی ہماری وفا کی ریت
جتنا جگر تھا خونِ جگر کر چکے ہیں ہم

اتنا گداز دل تو ملا تیرے عشق میں
اب دشمنوں کے دل میں بھی گھر کر چکے ہیں ہم

فُرصت ملے تو نظروں کی تحریر پڑھ کے دیکھ
حسرت سے تیری سمت نظر کر چکے ہیں ہم

تیری جفا پہ اب نہ کوئی آنچ آئے گی
آہوں کو بے نیازِ اثر کر چکے ہیں ہم

کہیئے امیرؔ اب نہ کریں زحمتِ کرم
ترکِ وفا کا عزم اِدھر کر چکے ہیں ہم

☆☆☆

ابیات

بیگانگی سی اُنکی نگاہوں میں آگئی
لگتا ہے اب ہماری ضرورت نہیں رہی

☆☆☆

کیوں آتے ہیں، کیوں چلے جاتے ہیں آپ
میں ایک شاہراہ تو نہیں کہ گرد اڑا کے چلے

☆☆☆

۱۲۔ غزل

یاد آتی ہیں ابھی تک وہ بہاریں اپنی
ہائے برسات کی بھیگی ہوئی راتیں اپنی

سنسناہٹ سی رگِ جاں سے گزر جاتی تھی
جب بھی ملتی تھیں نگاہوں سے نگاہیں اپنی

وہ تیری شوخ ادائیں وہ جوانی کا خروش
اُکھڑی سانسوں میں مناجات کی باتیں اپنی

ہاں کبھی آکے اچانک وہ لپٹنا تیرا
تیری بانہوں میں وہ اُلجھی ہوئی باہیں اپنی

کب امیرؔ آیا ہے جینے کا سلیقہ ہم کو
جبکہ دو چار فقط رہ گئیں سانسیں اپنی

☆☆☆

۱۳۔ غزل

پھر مرے دل میں تری یاد اُتر آئی ہے
پھر مرے دل پہ محبت کی گھٹا چھائی ہے

فکرِ دوراں سے جو بوجھل تھے ترے نقشِ جمال
جانے کیوں رات انہیں پھر سے لئے آئی ہے

کس کے آنسو ہیں یہ پھولوں پہ چمکتی شبنم
کس کی آہوں کی صدا بادِ صبا لائی ہے

میری پلکوں پہ ہیں روشن تری یادوں کے چراغ
کتنا پُر نور مرا عالمِ تنہائی ہے

ہے یہی انجمن ناز میں پہچان مری
میں تماشا ہوں، ہر اک شخص تماشائی ہے

میری یہ جھوٹی ہنسی پر نہ یقین کر اے امیرؔ
سینکڑوں اشک پیئے ہیں تو ہنسی آئی ہے

۱۴۔ دو غزلہ

جو ہے باطن، جو پردہ دار رہے
دلِ ناداں اسی پہ وار رہے

کچھ طبیعت پہ اختیار رہے
ذکر اُن کا نہ بار بار رہے

وصلِ فردا کا انتظار رہے
اپنی قسمت کا اعتبار رہے

جتنے دُنیا کے کاروبار رہے
ہم نہ یکتا نہ ہوشیار رہے ●

کون کہتا ہے بادہ خوار رہے
اس کی آنکھوں کا بس خُمار رہے

کچھ پریشانِ روزگار رہے
کچھ زمانے سے زیر بار رہے

لائی ہستی وُجود میں ہم کو
آئے دنیا میں دن گزار رہے

توبہ کر کے ہر اک گناہ کے بعد
تیری رحمت کے خواستگار رہے

کون سمجھے تری خموشی کو
کچھ تو کہیے کہ دل فگار رہے

پہلے سُننے سے مُدعا میرا
مجھ سے کہتے ہیں اختصار رہے

رسم ہوتی ہے بزمِ رنداں میں
جو بھی آئے وہ بادہ خوار رہے

جا کے سوتے ہیں آج تُربت پر
نیند شاید کہ استوار رہے

پھول کھلتے رہیں گے زخموں کے
صحنِ گلشن میں ابر و بار رہے

حرف آئے نہ اپنی اُلفت پر
دامن اپنا نہ تار تار رہے

زندگی کس طرح یہاں کٹتی
تھی اک امید، امیدوار رہے

برق بیتاب ہے گھٹاؤں میں
گنج تنکوں کا نہ شکار رہے

پھول توڑیں ذرا سنبھل کے امیرؔ
ساتھ پھولوں کے خُفتہ خار رہے

☆☆☆

۱۵۔ غزل

ہوئی سحر تو شب غم کا اضطراب نہ تھا
جنونِ عشق اِدھر، اور اُدھر شباب نہ تھا

رہی نہ رونقِ محفل جو اُس کے جانے سے
فسونِ رقص گیا، نغمۂ رباب نہ تھا

یہ فائدہ تو ہوا مجھ کو دشت گردی سے
پتے کو اپنے کوئی خانہ خراب نہ تھا

سُنا تھا پہلی نظر میں دِلوں کا ٹکرانا
نظر جو اُن سے مِل کل تو اجتناب نہ تھا

رہا نہ دردِ جگر، جو رہا نہ عشقِ بتاں
وہ آنکھ سوکھ گئی جسکو عذرِ آب نہ تھا

سوال ایک اِدھر اور اُدھر ہزار جواب
مرے سوال کا لیکن کوئی جواب نہ تھا

ہوا ہے عُمر کے ساتھ بحرِ عشق اور عمیق
اگرچہ سطح پہ کچھ نقشِ موجِ آب نہ تھا

حسین تھے کتنے مرے خواب نوجوانی کے
امیؔر وقتِ سحر ایسا کوئی خواب نہ تھا

☆☆☆

ابیات

مکاں تو بن گیا، لیکن بنا نہ گھر میرا
چراغ نے ہی جلایا چراغ داں کو میرے

☆☆☆

میں سجدہ کرتا ہوں تجھ کو مگر اے ربِ جلیل
قضائے کار، خیال اسکا بھی آ جاتا ہے

☆☆☆

۱۶۔ غزل

چاند نکلا تو اُن کی یاد آئی
بڑھ گئی اور میری تنہائی

برق جب بادلوں میں لہرائی
یاد آتی ہے اس کی انگڑائی

دل میں، آنکھوں میں، آسمانوں پر
چاند تاروں میں ان کی رعنائی

شب ہی جانے کلی پہ کیا گزری
صبح ہونے سے پہلے مرجھائی

شب ہجراں کی کیا سحر دیکھی
شب تاریک کی تھی گہرائی

محوِ حسنِ فلک تھے دیدہ و دل
کیوں نہ کرتے یہ چرخ پیمائی

محبتِ خود آفتہ

پھر سے جاگا ہے مرے دل میں محبت کا جنوں
پھر سے اُمید نے پھینکی ہے ستاروں پہ کمند
پھر سے ارمان مرے لینے لگے انگڑائی
جوشِ جذبات نے توڑا ہے مرے صبر کا بند

پھر درخشاں ہے نگاہوں میں تبسم اُس کا
جس سے انجانے میں دیروز ملاقات ہوئی
جس کی صہبائے جوانی میں تھا جادو کا اثر
جس سے ڈرتے ہوئے کل رات مری بات ہوئی

میں نے سوچا تھا کنارا میں کروں گا اُس سے
نہ بنوں گا کسی زلفِ پریشاں کا اسیر
دل کو یقیں ہے کہاں ہوش و خرد سے رشتہ
ہے شکستہ یہ مرا زہد، محبت کا اسیر

دل کو ایسی جلا تو دے اپنے
نہ شکیبا، نہ ہو شکیبائی

رکھا جس نے ہے پھونک پھونک قدم
ٹھوکر اس نے ہی ہر قدم کھائی

ماہِ تاباں پہ بادلوں کا خروش
زُلف چہرے پہ اس کے لہرائی

نام اُن کا زباں پہ جب آیا
میری آواز پھر سے بھر آئی

بات شعر وسخن کی کس سے کریں
رہیں آباد و شاد *قدوائی

☆☆☆

میرے عزیز وعالم دوست انیسؔ قدوائی مرحوم

۱۷۔ غزل

اب میرے بعد کس پہ جفا کیجئے گا آپ
دردِ فراق کس کو عطا کیجئے گا آپ

ہوگی جسے نہ آپ کی چاہت، نہ آرزو
شاید اُسی سے عہدِ وفا کیجئے گا آپ

حالت پہ اپنی آپ بھی روئیں گے ایک دن
جب بھی کسی کو اپنا خدا کیجئے گا آپ

نغموں میں میرے آپ کی پنہاں ہے داستاں
جب ہم نہیں رہیں گے سُنا کیجئے گا آپ

اپنا علاج، آپ ہی بیمارِ دل کرے
کہتے ہیں یہ حکیم دعا کیجئے گا آپ

دل ٹوٹنے پہ اتنا پریشان تو نہ ہوں
ہوتا یہی ہے پیار میں، کیا کیجئے گا آپ

دل میرا اب کسی سے لگے نہ کبھی امیرؔ
میرے لیے بس اتنی دُعا کیجئے گا آپ

☆☆☆

ابیات

ان بُت کدوں سے دور رہا کیجئے گا
دل کے کہے کو اب نہ سنا کیجئے گا

☆☆☆

نوکر سے کہہ دیا جو کیا میں نے ان کو فون
''صاحب کو تم بتاؤ کہ گھر پر نہیں ہیں ہم''

☆☆☆

اے فلک یہ تو بتا تیری مشیّت کیا تھی
کر دیا گلشن اُردو کو ایسے کیوں تاراج

☆☆☆

۱۸۔ غزل

اقرار وفا تیرا دکھانے کے لئے تھا
وعدہ جو کیا ہم نے نبھانے کے لئے تھا

دل میں جو محبت کا دِیا رکھا تھا تو نے
ہم کو نہ پتہ تھا وہ بجھانے کے لئے تھا

کیا خوب کہ ممکن نہیں جس خواب کی تعبیر
وہ خواب بس آنکھوں میں بسانے کے لئے تھا

کیوں کھینچ لیا جام بڑھا کر مرے آگے
کیا پیاس مری اور بڑھانے کے لئے تھا

اس مشربِ رنداں کے لئے کوئی تو ہوتا
کعبے کا ہر اک بُت نہ گرانے کے لئے تھا

اب ہوگی کہاں بندۂ میکش کی عبادت
ساقی نہ کوئی جام پلانے کے لئے تھا

چپکے ہوئے بدن سے ہیں بھیگے ہوئے کپڑے
شبنم سے گل تر بھی نہانے کے لئے تھا

گھر ہی میں تھا جو فتنۂ بربادیٔ خانہ
شاید نہ مکاں اپنا بسانے کے لئے تھا

ہم بھول گئے اپنی مشیت کے تقاضے
ہر دن جو گزارا وہ زمانے کے لئے تھا

☆☆☆

بیت

ہاں میرے شیشۂ دل کو نہ توڑ، اے ظالم
گلابِ عشق اسی ظرف میں ہی رکھتے ہیں

☆☆☆

۱۹۔ غزل

طولِ شب سامنے، اک ہجر کی تنہائی ہے
دل کے بہلانے کو یادوں کی مسیحائی ہے

دل ہے لبریز شکایت سے مگر کیا کیجئے
پائے آداب میں زنجیرِ شکیبائی ہے

ان کے وعدہ پہ ذرا میں جو یقیں کرنے لگا
بولے گھبرا کے، قسم ہم نے نہیں کھائی ہے

زندگی بھر مجھے آنسو تھے رُلائے جس نے
چشمِ تر لے کے وہ تربت پہ مرے آئی ہے

ایک شاعر کے تصور سے کہاں چھپتا ہے
بند آنکھوں میں جھلکتی تری پرچھائی ہے

رُک سی جاتی ہے گھٹا کر کے ترشُّح کچھ دم
کس تذبذب میں ہے، کیوں آ کے یہاں چھائی ہے

کتنی امیدوں سے آغاز سفر کرتے ہیں
زندگی کیا ہے، فقط فاصلہ پیمائی ہے

ہم نے سیکھا ہے یہ نیرنگِ زمانہ سے امیرؔ
نہ مسیحا ہے یہاں اور نہ مسیحائی ہے

☆☆☆

ابیات

قسمت کا گلہ، شکوۂ صیّاد کہاں تک
اے قوم رہے گی یونہی برباد کہاں تک

☆☆☆

مجھے بنانے کی، ضد اسکو ہے مٹانے کی
ہیں چار تنکے ادھر اور اُدھر ہے عزمِ فنا

☆☆☆

۲۰۔ غزل

اک حادثہ ہے جس میں بہے جا رہے ہیں ہم
قرضِ حیات یعنی دیئے جا رہے ہیں ہم

آبِ سُمِ حیات پیے جا رہے ہیں ہم
مرنے کا ڈر جو ہے تو جیے جا رہے ہیں ہم

واضح تو ہو حیات کا مقصد مرے خدا
کیوں بارِ غم ہزار سہے جا رہے ہیں ہم

پھولوں کی بات تو نہ سمجھ پائے ہم کبھی
بلبل سے ہمکلام ہوئے جا رہے ہیں ہم

سیکھا چمن میں برگ سے، شبنم سے، پھول سے
درسِ حیات اُن سے لئے جا رہے ہیں ہم

نیلا سماں ہے، دوب کی نرمی ہے زیرِ پا
پگڈنڈیوں پہ مست چلے جا رہے ہیں ہم

کیجئے نہ گفتگو کی مری شرح اے امیرؔ
دیوانگی میں کیا کیا بکے جا رہے ہیں ہم

☆☆☆☆

ابیات

وہ سو رہے ہیں، حُسن تماشا ہے جلوہ گر
آواز مت کرو کہ فسوں ٹوٹ جائے گا

☆☆☆☆

جئے تو جاتا ہوں فردا کی جستجو میں امیرؔ
مگر فنا کا بھی اکثر خیال آتا ہے

☆☆☆☆

۲۱۔ غزل

دل کی دنیا بسائے بیٹھے ہیں
یادیں اُن کی سجائے بیٹھے ہیں

اُن کے جلوے کے ہم مجاز نہیں
نظریں نیچی جُھکائے بیٹھے ہیں

ماہِ باراں سے ٹھن گئی شاید
زُلفیں رُخ پر اُڑائے بیٹھے ہیں

حرف اُن پر کہیں نہ آجائے
راز دل کے چھپائے بیٹھے ہیں

ہوتے برہم ہیں کس ادا سے وہ
چھیڑ اُن سے لگائے بیٹھے ہیں

پہلی ملاقات

ایک جھنکار سی ہو لَمس سے جاں میں پیدا
نظریں مل جائیں تو اک برق رواں ہوتی ہے

شورِ جذبات سے یوں عالمِ مدہوشی ہے
نُطقِ خاموش سے ہر بات عیاں ہوتی ہے

ترکِ آداب ہے جذبات کا عُریاں ہونا
قیدِ احساس بھی اک شکلِ گراں ہوتی ہے

دو گھڑی کے لئے کل اُن سے ملاقات ہوئی
اِنتہا پیار کی دیکھیں کہ کہاں ہوتی ہے

☆☆☆

اتنی آساں نہیں زباں دانی
گورا کاغذ بچھائے بیٹھے ہیں

آنکھیں ملتے، جماہی لیتے ہیں
ہم جو ان کو جگائے بیٹھے ہیں

☆☆☆

ابیات

خونِ جاں، شیر بنا کر جو پلایا تھا مجھے
آج وہ دیدۂ گریاں سے رواں ہوتا ہے
(اکبر بادشاہ کے شعر کا ترجمہ)

☆☆☆

خون کہ از مہر تو شُد شیر و بہ طفلی خوردم
باز آن شُد و از دیدہِ برون می آید

☆☆☆

۲۲۔ غزل

سوزِ اُلفت جگا رہا ہوں میں
دل کی بستی بسا رہا ہوں میں

اُس کی تصویر سامنے رکھ کر
دل کی محفل سجا رہا ہوں میں

دل کی باتیں نہ ہو عیاں اُس پر
آنکھیں اُس سے چرا رہا ہوں میں

شب ہے تاریک اور فضا خاموش
تنہا تنہا سا پا رہا ہوں میں

در تک جاتا ہوں، لوٹ آتا ہوں
جیسے یوں ہی اکتا رہا ہوں میں

میری اُلفت کا وہ یقیں نہ کریں
قسمیں کھانے کی کھا رہا ہوں میں

۲۳۔ غزل

اب خونِ جگر اور بہایا نہیں جاتا
بھیگی ہوئی آنکھوں کو سُکھایا نہیں جاتا

نکلے جو وطن سے تو بھٹکتے ہی رہے ہم
پردیس میں گھر اپنا بسایا نہیں جاتا

ہے آگ مرے دل میں محبت کی فروزاں
بھڑکے ہوئے شعلے کو بجھایا نہیں جاتا

امواجِ حوادث ہیں مُصر میری فنا پر
منجدھار میں کشتی کو ڈبویا نہیں جاتا

رکھنا ہے امیرؔ عزتِ فُقرا کا بھرم بھی
کشکولِ طلب آگے بڑھایا نہیں جاتا

۲۴۔ غزل

ناوک نے پھر ابرو کو کس شان سے تانا ہے
ہے تیرِ نظر اُسکا، دل اپنا نشانہ ہے

اے جوشِ جنوں تو بھی سُن لے جو وہ کہتے ہیں
''دامن سے مرے لپٹا یہ کون دِوانہ ہے''

ہے وہ ہی سبب میرے 'ہونے' یا 'نہ ہونے' کا
مرنے کا سبب گویا، جینے کا بہانہ ہے

کیا کاوشِ حق گوئی، کیا کوشش جاں ریزی
کیا پایا بھلا اُس نے جو عاقل و دانا ہے

محراب تصور میں بُت ہم نے سجائے ہیں
یعنی کہ حرم اپنا دل کا ہی یہ خانہ ہے

دالان میں بیٹھے ہیں بارش کا سماں دیکھیں
اک ہلکی سی خنکی ہے موسم بھی سہانا ہے

مٹی کی مہک سے کیا مدہوش فضائیں ہیں
اب تم بھی چلے آؤ ساون کا مہینہ ہے

پوچھو نہ امیرؔ اپنی رودادِ غمِ ہستی
وہ بھول گئے ہم کو، بس اتنا فسانہ ہے

☆☆☆

ابیات

تجھ کو پتہ ہے یار تیرے انتظار میں
گزرا ہوں اضطراب کی منزل سے کتنی بار

☆☆☆

خدا حرام نہ کرتا جو خودکشی تو پھر
سفرِ حیات کا ہم کب کا مختصر کرتے

☆☆☆

۳۵۔ غزل

فکرِ دوراں میں نہ ہستی کو مٹاتے یارو
بزمِ دنیا میں مزے کچھ تو اٹھاتے یارو

مشکلیں ایسی نہیں تھیں کہ نہ آ سکتے تم
وعدہ آنے کا کیا تھا تو نبھاتے یارو

کارِ دنیا سے یہ مانا کہ پریشاں ہو بہت
ہم سے ملنے کے بہانے بھی بناتے یارو

دوری ہو جاتی ہے اکثر یوں ہی انجانے میں
دور رہ کر مرا یوں دل نہ دکھاتے یارو

جیسے آتے تھے کبھی، آ کے مری دنیا میں
میری اجڑی ہوئی بستی کو بساتے یارو

کس کو پرواہے، ملے کون، کہاں کب کس سے
خوفِ دنیا سے نہ یوں خود کو ڈراتے یارو

پھر سے آغازِ محبت نہیں آساں اتنا
اپنی دیرینہ محبت کو نبھاتے یارو

پاس آتے مرے اک بار بصد ناز و ادا
اک جھلک اپنی مجھے آکے دکھاتے یارو

☆☆☆

ابیات

موجِ شباب، ہم بھی تو دیکھیں اُو پردہ دار
ٹکرا رہی ہے حُسن کے ساحل سے کس طرح

☆☆☆

دیکھا جو آئینے میں تو پوچھا یہ نقش سے
تو کون ہے، تو کیا ہے، یہاں کر رہا ہے کیا؟

☆☆☆

۲۶۔ غزل

کالے بالوں میں سفیدی سی نظر آنے لگی
جیسے پت جھڑ کی صدا نزدیک تر آنے لگی

مست پھرتے تھے، جوانی تھی بہارِ زندگی
اب خزاں کی کیفیت ہر سُو نظر آنے لگی

اک زمانہ تھا جگاتے، جاگتے تھے ساری رات
شام ہی سے نیند ہم کو اب مگر آنے لگی

بزم آرائی کا موسم خود بخود جانے لگا
فصلِ تنہائی، دبے پاؤں جو گھر آنے لگی

مجھ کو اپنی پاک دامانی کا اندازہ ہوا
بے گناہی کی جو تہمت میرے سر آنے لگی

قید کر غزلوں میں انکی ہر ادا کو اے امیرؔ
شعر میں تیرے جو تنویرِ سحر آنے لگی

۲۷۔ غزل

ہے پوشاک ان کی گلابی گلابی
ہے ہونٹوں کی رنگت عُنابی عُنابی

غزالی یہ آنکھیں یہ ابرو ہلالی
جسے دیکھیں اس کی خرابی خرابی

یہ زلفوں کو دیکھو، گھٹاؤں کو دیکھو
یہ انداز دیکھو نوابی نوابی

ہنسی میں شرارت قیامت خدا کی
نگاہوں میں مستی شرابی شرابی

کریں گفتگو تو سمجھ میں نہ آئے
سوالوں میں باتیں جوابی جوابی

مرے مدعا پر نہ بولے زباں سے
نگاہوں سے دیکھا عِتابی عِتابی

نہ جاگوں نہ سوؤں، لوں کروٹ پہ کروٹ
انہیں جب سے دیکھا بے خوابی بے خوابی

مرا جام خالی رہے ساقیا کیوں
یہ دریا میں کیسی بے آبی بے آبی

☆☆☆

بیت

چمن میں پھر سے مکاں اپنا کیا بنائیں ہم
جو شاخ چنتا ہوں، اس پہ نظر ہے بجلی کی

☆☆☆

دمِ رُخصت (آزاد نظم)

دمِ رخصت وہ تیرا مجھ سے گھبرا کر لپٹ جانا
تری باہوں کی گرمی سے میں صد شعلہ بہ داماں تھا
بدن میں سنسناہٹ، خوں میں جیسے برق دوڑی تھی
اندھیرا آنکھ میں میرے تھا پاؤں لڑکھڑائے تھے
گھنے جذبات کے بادل امنڈ کر دل پہ چھائے تھے

سنائی کچھ نہ دیتا تھا، نظر بھی کچھ نہ آتا تھا
وہ ساعت، کیسی ساعت تھی، سمجھ میں کچھ نہ پاتا تھا
ملے تھے جب گلے تو ہو گئے تھے ایک جاں شاید
تجھے معلوم ہے تیری امانت زندگی میری
میری سانسوں کی حرکت ہے تسلسل تیری سانسوں کا
سمجھ یوں، تیرا ملنا مجھ سے شاید اذنِ غائب تھا

۲۸۔ غزل

عُنابی جامۂ اَحمر ہے گُل بدن کے لئے
بہ رنگِ لالہ ہو تزئین پیرہن کے لئے

سما گئی مری نظروں میں وہ جھلک اُسکی
جھلک تھی یا خُمِ دُو آتشہ دہن کے لئے

وہ میرے دیدۂ حیراں سے بدگماں کیوں ہے
مری نظر تو نہ تھی کوئی سوئے ظن کے لئے

لگا کے آگ جو احساسِ احتساب نہیں
تو یہ سمجھ کہ یہ شیوہ ہے فتنہ تن کے لئے

اُلجھ نہ جائے کہیں پاؤں ان کے زینہ پر
اٹھایا ناز سے دامن کو بانکپن کے لئے

امیرؔ آؤ نہ دھوکے میں، ہے سرابِ نظر
یہی تو تیر کماں میں ہے صف شکن کے لئے

☆☆☆

۲۹۔ غزل

پھرتے ہیں ڈھونڈتے ہوئے دامِ خطر کو ہم
اوڑھے ہوئے ہیں ناز سے گردِ سفر کو ہم

رستے کا ہے نشان نہ منزل کا ہے سُراغ
شوقِ سفر میں چھوڑ کے آئے ہیں گھر کو ہم

سالارِ کارواں کوئی ہوتا تو پوچھتے
اس وشتِ بے کنار میں جائیں کدھر کو ہم

خائف تھے ایسے بختِ سیہ سے کہ جب ہنسے
گھبرا کے دیکھتے ہیں ادھر کو، اُدھر کو ہم

آرام سے، سکون سے، کیا واسطہ امیرؔ
راہوں میں اب تلاش کریں کیوں شجر کو ہم

THIS EBOOK IS DOWNLOADED FROM
SHAAHISHAYARI.COM

LARGEST COLLECTION OF URDU
SHERS, GHAZALS, NAZMS AND EBOOKS.

۳۰۔ غزل

غزل کہی ہے اثر فتنہ گر پہ ہو کہ نہ ہو
کہیں وہ میری عداوت میں شر پہ ہو کہ نہ ہو

ہے فکر اہلِ زباں کو زباں کی صحت میں
ہر ایک لفظ کے زیر و زبر پہ ہو کہ نہ ہو

بسا لوں آنکھ میں دائم ادائے حسن و شباب
کرم جو ہے، وہ مری چشمِ تر پہ ہو کہ نہ ہو

ذرا ٹھہر کہ میں پروازِ حُسن کو دیکھوں
ترا یہ اَوج کہیں پھر سفر پہ ہو کہ نہ ہو

کہا بکھیر کے چہرے پر اپنی زُلفِ سیاہ
یہ ہالہ اَبر کا روئے قمر پہ ہو کہ نہ ہو

نہ خوئے حُسن ہی بدلی، نہ عشق کی فطرت
یہ میری سجدہ جبیں اُس کے در پہ ہو کہ نہ ہو

نظامِ دینِ الٰہی ہے خلق کی خدمت
عیاں یہ اذنِ خدا اس بشر پہ ہو کہ نہ ہو

نہ کوئی داد ہے، پرسش، نہ کوئی شنوائی
یہ تیرِ جہل کا زخمِ جگر پہ ہو کہ نہ ہو

جرس جو وقت کی، ہم نے سُنی نہ صبحِ حیات
غروبِ شام، دھیاں کیا گجر پہ ہو کہ نہ ہو

جلے جو دل تو نکلتی ہے آہِ سرد امیرؔ
دھواں دھواں سا یہ نوکِ شرر پہ ہو کہ نہ ہو

۱۳۱۔ غزل

شوریدہ دل ہے ہم کو نہیں خواہشِ جہاں
اپنی بلا سے بامِ فلک ہوگی کہکشاں

آتا وہ کام، خون کے آنسو میں پی گیا
بہر شمت محشر میں دامن وہ خونچکاں

انکار کب تھا، پاس تھا جو اپنی رسم کا
وہ کہہ سکے نہ میری کسی التجا پہ 'ہاں'

منظور ہے فلک کو مری گردشِ سفر
لے جائے گی یہ سازشِ بختِ سیہ کہاں

غیروں پہ کیا عیاں ہو، یہاں اپنے آپ پر
معنی خود اپنی بات کے ہوتے نہیں عیاں

سایہ گھنا جو ہو تو مسافر ہے ٹھہرتا
زیرِ ببُول رکتا نہیں کوئی کارواں

ڈھونڈا کئے فلک پہ ہم اسرارِ زندگی
عالم کا راز ہستیء ذرّہ میں تھا نہاں

طوفاں کا ڈر ہے اور نہ ہم کو نہنگ کا
ہے ناخدا کا خوف جو تھامے ہے بادباں

سایہ گھٹا کا، سیلِ رواں، میں نہیں امیرؔ
دریوزہ گر ہوں، میری جبیں اسکا آستاں

☆☆☆☆

بیت

دوزخ کی آگ میں بھی تپش اتنی ہے کہاں
انساں کی خوء بد کی کثافت جلا سکے

☆☆☆☆

۳۲۔ غزل

اب سوچ لیا میں نے بھی وہ آئیں، نہ آئیں
تنہائی میں خود محفل رنگین سجائیں

اک نقشِ حسیں سامنے رکھ کر اُسے دیکھیں
تاریک جو محراب ہے، اک شمع جلائیں

پروانے کو پھر جلتا ہوا دیکھیں شمع پر
یاد آئے اگر بھولا ہوا گیت تو گائیں

دیوار کا ٹیکا لئے آنکھوں کو کئے بند
یادوں کا چھلکتا ہوا پیمانہ اٹھائیں

سوچیں کوئی تدبیر کہ ہوجائیں ہم آزاد
اِس سوزشِ دل، شعلۂ اُلفت کو بجھائیں

جو دل میں بسا رکھا ہے بُت خانہ وہ توڑیں
غم اپنا غلط کرنے کو میخانہ بسائیں

دیدار کی حسرت نہیں اب دل میں ہمارے
وہ سامنے آئیں بھی تو ہم آنکھیں چُرائیں

جب پھول کھلیں، یاد نہیں یار کی آئے
کوئل کی صدا پر نہ کبھی اشک بہائیں

ان حضرت دل کو بھی تو سمجھانا پڑے گا
جو مل نہ سکے اس کو نہ آنکھوں میں بسائیں

کیوں کھیل محبت کا ہمیں راس نہ آیا
گھیرے ہوئے دنیا میں ہیں دنیا کی بلائیں

تسکین دل و جاں کے لئے، آؤ امیرؔ اب
اس پیار و محبت کے فسانے کو بھلائیں

۳۳۔ غزل

کیوں خیالوں میں یار آتا ہے
دل بے تاب رُک سا جاتا ہے

چشم گریاں سے چشم یار تلک
تار اشکوں کا بن سا جاتا ہے

کیا اُجالوں سے فائدہ اس کو
جو اندھیروں سے فیض پاتا ہے

گفتگو اس سے کی تو تھی میں نے
حرفِ مطلب زباں پہ آتا ہے!

وہ ہی پائے گا منزلوں کا سراغ
گرد راہوں میں جو اُڑاتا ہے

سمجھ یہ کاوشیں جو صرفِ تحریرِ حکایت ہیں
انہیں سے کچھ نشاں ہم چھوڑ جائیں دارِ فانی میں
ہماری دوریاں شاید کبھی ایسے نہ کم ہونگی
ہمارے راستے بھی آتے آتے مڑ بھی جائیں گے
مگر اے جانِ جاں فرقت میں بھی ہوتی رفاقت ہے
ہزاروں دوریاں بھی قرب ہو جائیں جو اُلفت ہے

☆☆☆

قطعہ

پتہ چلا یہ مجھے زندگی سے جب گزرا
یقیں نہیں ہے کسی بات کا زمانے کی
جسے نہ دیکھ سکوں، وہ حقیقتِ دائم
جو سامنے ہے، وہ تصویر ہے فسانے کی

دل تڑپتا ہے جب بھی شاعر کا
رنگِ محفل ترنگ پہ آتا ہے

کس سے کہتا ہے مدعا اپنا
کس کو غم اپنا تو سناتا ہے

☆☆☆

ابیات

تاریخ دُہراتی ہے خود کو، اس لئے دانشوراں
دیکھ کر ماضی کو فردا میں اٹھاتے ہیں قدم

☆☆☆

جو چھپے رہتے ہیں میرے ذہن کی گہرائی میں
ایسے جذبوں کو پرویا ریختی کے تار میں

☆☆☆

۳۴۔ غزل

طالبِ نرمئ گفتار ہوں، گفتار نہیں
ہو نہیں شوخئ اظہار تو اظہار نہیں

شورِ بازار میں، ہر کوئی خریدار نہیں
ہوں یہاں، جب کہ مرا کوئی سروکار نہیں

کیوں اٹھی میری طرف پھر وہی بیگانہ نظر
شاید مقتل میں رہا کوئی خطا وار نہیں

وحشتِ دل نے کیا اس سے تھا در پردہ سوال
ویسے معلوم تھا وہ میرا طلب گار نہیں

میں بھلا کون ہوں جس پر وہ کرم فرماتے
تھی یہی بات، انہیں خاطرِ اغیار نہیں

ہو اگر پیار، بہانے ہیں بہت ملنے کے
کیا کرے کوئی جو ملنے پہ وہ تیار نہیں

کچھ اشارہ ہی کریں، جنبشِ مژگاں ہی سہی
ہاں چلو گرچہ کوئی وعدہ و اقرار نہیں

جی میں آیا تھا چلوں کوچۂ یاراں کی طرف
یہ بھی سوچا کہ کروں ان کو گراں بار نہیں

کنجِ عزلت میں یونہی میری گزرتی ہے امیرؔ
بات کرنے کو یہاں کوئی بھی تیار نہیں

سو بھی جاؤ کہ بڑی دیر سے جاگے ہو امیرؔ
خوابِ غفلت کو سنا فرصتِ بیدار نہیں

۳۵۔ غزل

راہ ہم کو کوئی نظر آتی
کبھی آوازِ ہمسفر آتی

شبِ ہجراں کہاں گزرتی ہے
وہ نہ آتے تو کیا سحر آتی!

اُن سے کتنا کریں گے ہم اصرار
بات ہر پھر کے کیوں دِگر آتی

اُس کی حُجت، مری دلیل الگ
کوئی صورت دِگر نہ بر آتی

کوئی ہمدرد و مونس و غمخوار
کوئی تصویرِ ہمسفر آتی

تیرا انداز کج روی ہے امیرؔ
ورنہ ہستی تری نکھر آتی

☆☆☆

۳۶۔ غزل

بذلہ سنجی سے ہے تعریف سخن کاری کی
نہ کریں دوست ستائش مری فنکاری کی!

نہ جگا ہم کو سحر خوابِ بتاں کے دوراں
اب کہاں ہے ہمیں فرصت یہاں بیداری کی

ساقیا کیسے ہو اظہارِ حقیقت سے گریز
کیا برائی ہے جو حاجت رہے میخواری کی

دل تو بیتاب تھا گو منزلِ جاناں کے لئے
لیکن اس راہ میں قسمت نے نہ دلداری کی

حوریں جنت میں سنا ہے کہ پلائیں گی شراب
پھر کیوں تہمت ہے یہاں ہم پہ گنہگاری کی

۳۷۔ غزل

دل کا چراغ آتشِ گل سے جلا لیا
ہر ایک غمِ حیات کو جیسے کہ پالیا

اُس کی جفا سے ہم کو بہت تھیں شکایتیں
''کیسے ہیں آپ'' اُس نے کہا اور منا لیا

غیرت ہی کچھ رہی، نہ رہا آبرو کا پاس
آئے نہیں! یہ کہہ کہ ہمیں پھر بُلا لیا

انداز و نازِ حُسن، قیامت سے کم نہ تھے
نظریں چُرا کے اس نے مرا دل چُرا لیا

ہم بے بسی میں اپنی پڑے دیکھتے رہے
ہمت وروں نے منزلِ مقصد کو پا لیا

مجھ کو شبِ حیات میں آنے لگی جو نیند
لے کر فنا نے گود میں اپنی سُلا لیا

سمجھے ہوئے تھے فصلِ بہاراں دوام ہے
لیکن خزاں نے اپنا تسلّط جما لیا

دل کی لگی نے ہم کو کہیں کا نہیں رکھا
اُس کی ادائے ناز پہ خود کو مٹا لیا

دیکھی امیرؔ ہم نے جو پھولوں کی بے رخی
سینے سے نوکِ خارِ چمن کو لگا لیا

☆☆☆

بیت

پاؤ گے کچھ بتوں سے نہ، اور کچھ خدا سے تم
حسنِ طلب بھی چاہیے، صدق دعا کے ساتھ

۳۸۔ غزل

یہ بتاؤ کہ ستائے کو ستاتے کیوں ہو
جو رو رہا ہے اسے اور رُلاتے کیوں ہو

زندگی بھر جو رہا کشتۂ اسرار سراب
راہ گم گشتہ اُسے پھر سے دکھاتے کیوں ہو

ہے عناصر کا تناسب بھی بقا سے منسوب
زد میں طوفاں کے دیا اپنا جلاتے کیوں ہو

جبکہ اصرار ترقی و تغیر واجب
رسم آداب کہن اپنے مٹاتے کیوں ہو

لینا واجب ہے اگر میرے گناہوں کا حساب
میرے ایثار و محبت کو بھلاتے کیوں ہو

ابھی تو آیا ہوں ساقی، ابھی ہے شب باقی
جام و مینا مرے آگے سے اٹھاتے کیوں ہو

رسمِ آداب کہاں حُسن کی فطرت میں امیرؔ
دل میں جو آئے کرو، بات بناتے کیوں ہو

☆☆☆

ابیات

وہ رنگ و بو، وہ خد و خال اور آب و تاب
اک خامۂ گلدوز میں پنہاں ہے وہ شباب

☆☆☆

دل توڑتے ہیں کیسے جو پوچھا جناب سے
توڑا کلی کو شاخ سے، کہنے لگے کہ 'یوں'

☆☆☆

۳۹۔ غزل

جاتے ہیں مے کدے میں کبھی تشنگی کے بیچ
یا بُت کدے میں بیٹھ رہے دل لگی کے بیچ

زاہد کو مجھ سے ترکِ خرابات چاہیے
ذکرِ فنا نہ مجھ سے کرو زندگی کے بیچ

حسن جمال اُنکا بڑھا سادگی میں اور
دیکھا جمالِ یار کو کل سادگی کے بیچ

صحرا میں کیوں امید بہاراں تجھے رہے
عارف کی کیوں تلاش ہو دیوانگی کے بیچ

Prof. S... DAULVI COLLECTION

آدم کی خو کو دیکھ کے روشن ہوا ہے، کیوں
شیطاں نے سر کو خم نہ کیا بندگی کے بیچ

کاٹی شبِ فراق ہے کچھ اس طرح امیرؔ
بیٹھے رہے امید میں شرمندگی کے بیچ

☆☆☆

زمانہ تھا

زمانہ تھا کہ میری مائیگی اُس کا تصوّر تھا
اُسی کی یاد میں پہروں یہ دل کھویا سا رہتا تھا
اُسی کے انتظارِ جاں بلب سے صبح ہوتی تھی
اُسی کی آرزو میں شام سے میں جلتا رہتا تھا

مگر پھر حادثاتِ زندگی نے وہ فسوں توڑا
یقینِ آشنائی کا مرا سارا جنوں توڑا

☆☆☆

قطعہ

دیکھیے مشرق میں سورج کا ابھار
روشنی کا آسماں پر ہے فشار
ہوگیا ہے دم بہ خود سارا جہاں
گر رہی ہے نور کی ہلکی پھوار

۴۰۔ غزل

پرندوں کے چہکنے کی صدائیں اچھی لگتی ہیں
ہاں شاخوں پر پُھد کنے کی ادائیں اچھی لگتی ہیں

معطر ان کی خوشبو سے فضائیں اچھی لگتی ہیں
جو کھیلیں انکی زُلفوں سے ہوائیں اچھی لگتی ہیں

گلے میں ڈالتے ہیں اپنی باہیں پیار سے کتنی
یہی تو پیار کی اُنکی ادائیں اچھی لگتی ہیں

جو گُل بن میں لگ کے اپنے دل میں ہوک اُٹھتی ہے
مری آہوں میں مل کر اُنکی آہیں اچھی لگتی ہیں

چنبیلی کا ہے منڈوا اور پھولوں سے جُھکی شاخیں
جو پھولوں سے مہکتی ہیں ہوائیں، اچھی لگتی ہیں

نگاہوں کو حسیں قدرت کے منظر خوب بھاتے ہیں
ہمیں تو برق و طوفاں کی ادائیں اچھی لگتی ہیں

نہ ہوتیں گر اُمیدیں تو بسر اپنی کہاں ہوتی
اندھیرے میں اُمیدوں کی شعائیں اچھی لگتی ہیں

وہ غصہ کر کے مجھ سے پیار کرتے ہیں امیرؔ اکثر
یہی ہے بات جو اُنکی جفائیں اچھی لگتی ہیں

☆☆☆

ابیات

کاتبِ وقت کی کیسی یہ فسوں کاری ہے
ورق پلٹتا ہے ہستی کے ایک اک کر کے

☆☆☆

آیا نہیں جو خود سے جہاں میں، ہوا بشر
جس کا وجود خود سے ہوا، وہ ہوا 'خدا'

☆☆☆

۱۴۱۔ غزل

وصل کی رات سُلگتے ہوئے جذبات بھی ہیں
تیری شرمیلی نگاہوں کے طِلسمات بھی ہیں

تیری دھیمی سی ہنسی کے یہ مچلتے سائے
جن میں پوشیدہ مرے دل کی حکایات بھی ہیں

سُوکھ جاتی ہے زباں سوزِ تکلّم سے کبھی
کبھی اشکوں کی زباں قول و مقالات بھی ہیں

وعدۂ وصل نہ ہو وعدۂ فردا اُن کا
دل میں ایسے ہی کئی تشنہ سوالات بھی ہیں

امتحاں صبر کا ہوتا ہی رہا تا بہ حیات
موت آئی تو سرِ نو سے حسابات بھی ہیں

☆☆☆

۴۲۔ غزل

قامت ہے سروؔ کی، تو ہے رنگت گلاب کی
ابرو ہلال کی ہے، جبیں ماہتاب کی

دیکھا جو میں نے، ہوگئے شرما کے لالہ فام
تصویر بن گئے ہیں وہ رنگِ گلاب کی

آنکھیں ہیں اُن کی غیرتِ آہو و نیم باز
مستی چھلک رہی ہے نظر سے شراب کی

پریوں کا رنگ روپ تو دیکھا نہیں مگر
کیا کم ہے دیکھتا ہوں میں صورت جناب کی

سمٹے سے جا رہے ہیں بدن کو چُرا کے وہ
پھر بھی نہ چھپ سکے گی قیامت شباب کی

نظروں سے جب سلام کیا ہے امیرؔ نے
تصویر بن گئے وہ مکمل حجاب کی

☆☆☆

۴۳۔ غزل

دکھانے دوسروں کو زخم ہم اپنے کہاں جاتے
نہ ہوتا دل تو یہ رنج و الم اپنے کہاں جاتے

اگر مجبوریاں انساں کی قسمت میں نہیں ہوتیں
تو پھر یہ شورشیں، یہ درد و غم اپنے کہاں جاتے

ہے تو ہی کارواں میرا، نشاں منزل کا تو ہی ہے
نکل کر تیرے کوچے سے قدم اپنے کہاں جاتے

چلو اچھا ہوا، دل بن گیا اپنا صنم خانہ
بسے ہیں جو نگاہوں میں صنم اپنے کہاں جاتے

ہماری گمرہی نے اُن کو کچھ اعزاز تو بخشا
وگرنہ واعظان محترم اپنے کہاں جاتے

۴۴۔ غزل

کیا عہدِ محبت کا افسانہ بیاں کرتے
خوابیدہ تمنا کو پھر سے نہ جواں کرتے

آدابِ محبت کا کچھ پاس بھی رکھنا تھا
ہر رازِ محبت کو ایسے نہ عیاں کرتے

رُکتے ہیں قدم میرے جو پاؤں میں چھالے ہیں
اس دشت و بیاباں کو ورنہ نہ مکاں کرتے

خاروں میں اُلجھ کر کیوں ہستی کو مٹاتے ہو
ہیں پھول بھی گلشن میں صد رنگ فشاں کرتے

ذرّے کو بناتا ہے جیسے کہ صدف موتی
ہم جوہرِ انشا کو شعروں میں گراں کرتے

محروم ہیں سننے سے، یہ جانتے جو طائر
وہ سامنے پھولوں کے ایسے نہ فغاں کرتے

زنجیرِ شرافت نے کچھ ایسا جکڑ ڈالا
ہم جام اٹھاتے کیا، ہم رقص کہاں کرتے

خاموش ہی رہ جانا اچھا تھا امیرؔ اپنا
قصہ جو اُدھورا تھا اس کو نہ بیاں کرتے

☆☆☆

۴۵۔ غزل

قصور ہوگا کسی کا، سوال کیا کیجئے
جو ہونا تھا سو ہُوا، اب ملال کیا کیجئے

نقوشِ ماضی کو کیا دیکھتا ہے مُڑ مُڑ کر
بھلا دیا ہے جسے، پھر خیال کیا کیجئے

لگائی آگ تو دیکھیں چمن کو شعلہ بکف
جلا کے خود ہی چمن کو ملال کیا کیجئے

۴۶۔ غزل

اَدا حسین ہے کچھ ایسے مسکرانے کی
نظر لگے نہ کہیں آپ کو زمانے کی

صبوح ہے، جام ہے، ساقی ہے، ماہ و انجم ہیں
یہی تو رات ہے کچھ دل سے دل لگانے کی

خفا ہیں، دُور ہیں، آنکھیں چُرائے بیٹھے ہیں
قسم نہ کھائی ہو پھر آپ نے ستانے کی

اُفق پہ صبح کی سُرخی کو ہم نے دیکھا تھا
اَدا بھی آپ کی دیکھی ہے دل لبھانے کی

سکوتِ وُسعتِ کونین ٹوٹ جاتا ہے
جو بات ہوتی ہے چپکے سے دل لگانے کی

سُنا جو آئیں گے، دل اور ہوگیا مُضطر
خبر غلط نہ کہیں ہو یہ اُن کے آنے کی

یوں بار بار نہ اُٹھیے حُضور جانے کو
ابھی تو آئے ہیں، کرتے ہیں بات جانے کی

ہوا چلی تو مہک اُن کی آرہی ہے امیرؔ
صدا ابھی آئی ہے پائل کے چھنچھنانے کی

☆☆☆

ابیات

ہر ابتدا کی ہوتی ہے آخر کو انتہا
ختم سفر ہو خیر سے، کرتے ہیں بس دُعا

☆☆☆

راستے کے خار و سنگ سے اسطرح مانوس تھے
منزلیں آئیں مگر ہم آگے بڑھتے ہی رہے

☆☆☆

۴۷۔ غزل

وُفورِ عشق سے کچھ ایسے انقلاب آئے
جو پردہ دار تھے وہ خود سے بے نقاب آئے

دُعا وہ کیا کروں جس کا اثر نہ ہو کوئی
سوال کیا کروں جس کا نہ کچھ جواب آئے

ہر ایک خواہشِ دل نامراد ہوتی ہے
دُعا میں جب بھی کروں، کچھ نہ کچھ عذاب آئے

حیا و شرم ہی زیور ہیں حُسنِ مشرق کا
نہیں ہے شرم جسے، وہ ہی بے حجاب آئے

☆☆☆

اگر تو ہے

(فلوریڈا میں ایورگلیڈیز کے کنارے بہ وقت شام)

اگر تُو ہے تو یہ شمس و قمر بھی تاباں ہیں
سُبک ادا سے چلی آ رہی ہے بادِ نسیم
فلک پہ نیل ہے، سبزہ ہو سبزہ زاروں میں
کھلیں جو پھول تو آتی ہے مجھ کو بوئے ندیم

شفق پہ رنگِ حنا ہو اگر سحر آئے
سنہری دُھوپ بھی صحنِ چمن میں آتی ہے
ڈھلے جو شام تو رنجِ وداعِ روز نہیں
اندھیری رات بھی دل کی مراد لاتی ہے

تجھے بتاؤں میں کیا، تُو جو میرے ساتھ چلے
بہارِ صبح، شبِ رونقِ برات چلے

۴۸۔ غزل

شمع سوزاں سے عجب عشق ہے پروانوں کو
جان دے دی پہ سمجھ آئی نہ دیوانوں کو

مرتبے اُنکے فرشتوں سے سِوا ہو جاتے
پاسِ انسانیت ہوتا اگر انسانوں کو

آشیانے کی تباہی کا گلہ کیا کرتے
ہم نے لٹتے ہوئے دیکھا ہے گلستانوں کو

☆☆☆

۴۹۔ غزل

وہ ملاقات خوشگوار نہیں
دوستی جب کہ استوار نہیں

اک تذبذب کی کیفیت دائم
بات دل کی جو آشکار نہیں

زندگی کا کہاں بھروسہ ہے
آج ہے، کل کا اعتبار نہیں

کرکے توبہ ہوئے ہیں پھر تائب
دل پر اپنے کچھ اختیار نہیں

شبِ فُرقت ہے یا قیامت ہے
شبِ ہجراں کا اختصار نہیں

کر دے مدہوش اتنا اے ساقی
دل پہ اپنے ہو کوئی بار نہیں

کیسے گزرے خزاں رسیدہ دن
جو بہاروں کی یادگار نہیں

اُسکی محفل میں ہم کہاں جاتے
جب طبیعت ہی ساز گار نہیں

لوگ کہتے ہیں فصلِ گُل آئی
ہم نے دیکھی کوئی بہار نہیں

کر رہے کیوں ہو قافیہ بندی
دل تمہارا اگر فگار نہیں

کیسے اُس پر یقیں امیرؔ آئے
اُس کی چاہت کا اعتبار نہیں

۵۰۔ غزل

دل لگانے کی بات کرتے ہو
کس زمانے کی بات کرتے ہو

ساقیا کر چکا ہوں ترکِ صبوح
کیوں پلانے کی بات کرتے ہو

خیریت پوچھتے ہو کیوں رسما
دل دُکھانے کی بات کرتے ہو

وعدہ کر کے کبھی نہیں آتے
بھول جانے کی بات کرتے ہو

اسطرح مسکرا کے مت دیکھو
دل لُبھانے کی بات کرتے ہو

جس میں لکھی ہے داستاں میری
اس فسانے کی بات کرتے ہو

آؤ، بیٹھو، ابھی تو آئے ہو
کیوں یہ جانے کی بات کرتے ہو

پھر کہاں جاؤ گے بتاؤ امیرؔ
گھر جلانے کی بات کرتے ہو

☆☆☆

ابیات

ہر سو ہجوم و شور ہے، گرد و غبار و لُو
دِلّی میں دُور دُور تک پھیلی ہوئی ہے بُو

☆☆☆

یادوں میں اسکی پہلے پریشاں تھا میرا دل
اسکو بُھلا کے اور بھی رہتا ہے مضمحل

☆☆☆

۵۱۔ غزل

راہوں کے سنگ و خارِ مغیلاں کا کیا کروں
اِن حادثاتِ گردشِ دوراں کا کیا کروں

اس بے کسی کا، اس غمِ پنہاں کا کیا کروں
تنہا ہوں دردِ ہجرِ شبستاں کا کیا کروں

جو ہمسفر تھا، وہ ہی تھا رہزن دمِ حیات
ہوتے ہیں غیر، غیر، مہرباں کا کیا کروں

دعوت تو دے رہی ہیں بہاروں کی شوخیاں
صیاد کا، میں بندشِ زنداں کا کیا کروں

عُفّت کہاں رہے جو رہے صحبتِ اثیم
شیطاں سے بچ بھی جاؤں تو انساں کا کیا کروں

تقویٰ، ثواب، زہد میں رہنے کو تو رہوں
ان بُت کدوں کا، محفلِ خُوباں کا کیا کروں

حالت جُنوں کی ہے مری، مجھکو نہ دو صَلاح
دامن کو سی بھی لوں، تو گریباں کا کیا کروں

کھیتوں کے درمیاں ہے تو ارہ مرے لئے
محلوں کا، ناؤنوش کے ساماں کا کیا کروں

ہنس کر جو وہ ملے تو شکایت نہ کچھ رہی
سرخیِ لب کا میں دُرِ دنداں کا کیا کروں

روتا ہے دل یتیم و یسیراں کے حال پر
بدعت سہی، پہ دیدۂ گریاں کا کیا کروں

نظرِ کرم تو کی ہے مگر دیر سے امیرؔ
عمرِ رواں کا، وقتِ گریزاں کا کیا کروں

☆☆☆

۵۲۔ غزل

گنجے کو بال، رند کو میخانہ چاہیے
دانشوروں کے بیچ میں دیوانہ چاہیے

شاعر نہیں ہوں ایسا جو محفل کو لوٹ لوں
میری غزل کو صوفِ بزرگانہ چاہیے

کروٹ جو لی شباب نے تو عشق نے کہا
اے یار چل کہ ہمکو صنم خانہ چاہیے

دنیا کا ڈر نہ خاطرِ احباب کا ہے ہوش
دل کو ہمارے کوچۂ خوبانہ چاہیے

☆☆☆

پُرانی غزلیات[۱]

موجِ شباب، ہم بھی تو دیکھیں او پردہ دار
ٹکرا رہی ہے حسن کی ساحل سے کس طرح

سرورِ نغمگی میں وہ نشاطِ کیف کا چھانا
خیالِ یار کا آنا، خیالِ یار کا جانا

۱۔ یہ عام فہم غزلیں زیادہ تر فرمائش کے لئے لکھی گئی تھیں۔

۵۳۔ غزل

دیکھا ہے یہی اس دنیا میں، کچھ غیر یگانے ہوتے ہیں
دل توڑنے والوں کو دیکھو جانے پہچانے ہوتے ہیں

کیوں عقل جنوں سے کہتی ہے، امید نہ رکھیو اپنوں سے
جب وقت پڑے ہے مشکل کا تو سب بیگانے ہوتے ہیں

دنیا نے بہت کچھ سمجھایا، کب عشق کی فطرت بدلی ہے
لے نام نسیمِ دلبر کا، ہم اور دِوانے ہوتے ہیں

ہاں حاصلِ ہستی کو جانا وہ وقتِ شبستاں ساتھ ترے
جب قلقلِ مینا سنتے ہیں، خالی پیمانے ہوتے ہیں

☆☆☆

تو گر نہیں ہے تو شمس و قمر نہیں تاباں
فلک کا نیل بھی میرے لئے ہے بامِ رَمیم
گُلوں میں رنگ نہ سبزہ ہے سبزہ زاروں میں
نفس کے واسطے جیسے نہیں ہے بادِ شمیم

فلک پہ رنگِ سحر بے اثر سا ہوتا ہے
پہر، اُداس سی آہستہ گام آتی ہے
ڈھلے جو دن تو اُٹھے پھر سے دردِ تنہائی
نہیں جو تُو، تو شبِ تشنہ کام آتی ہے

بتاؤں کیا تجھے ہمدم، جو تُو نہیں ہوتا
تری ہی یاد میں دیوانہ شب نہیں سوتا

☆☆☆

۵۴۔ غزل

امید کے شعلہ کو بجھایا نہیں جاتا
یا رب تیرے وعدوں کو بھلایا نہیں جاتا

آساں ہے کہاں ٹوٹے ہوئے دل کو جڑانا
اجڑی ہوئی بستی کو بسایا نہیں جاتا

دیوار کو خم کردہ اٹھایا نہیں جاتا
مسجد کو نمائش میں بنایا نہیں جاتا

جنّت کی طلب میں نہ ہوئے نیک روش ہم
نیکی میں سکوں دل کا کیا پایا نہیں جاتا

ہوں نیک عمل، ساتھ عبادت کے فریضے
سجدوں سے فقط دین چلایا نہیں جاتا

منزل کی تمنا ہے تو، خاروں کی چبھن کیا
ڈر ڈر کے قدم آگے بڑھایا نہیں جاتا

زندہ اگر رہنا ہے تو رہ زندہ دلی سے
رو رو کے یہ ہستی کو مٹایا نہیں جاتا

بہتر ہے چلو تم بھی زمانے کی رَوِش پر
دنیا کے روایات کو توڑا نہیں جاتا

ہر کام کی ساعت ہے تو ہر بات کا موقع
طوفان میں لنگر کو اُٹھایا نہیں جاتا

اک موج سے پامال نہ ہو جائے ترا گھر
ساحل پہ گھروندوں کو بنایا نہیں جاتا

غزلوں میں ہے مضمون کی تکرار بھلا کیوں
انشا کو نئے رنگ سے سجایا نہیں جاتا؟

آخر میں عیاں مجھ پہ ہوئی بات یہ سید
خود سے تو حقیقت کو چھپایا نہیں جاتا

☆☆☆

۵۵۔ غزل

صنم خانے کہاں ہوں گے وہ دُختِ رز کہاں ہوگی
وہ لغزش آج کس کے پائے نازک سے جواں ہوگی

صبا گزری تھی اس منزل سے گلشن کی نہ جانے کب
قفس میں پھر سے رُودادِ بہارِ جاوداں ہوگی

مسلسل مئے نوازی ہورہی تھی چشمِ ساقی سے
کسے معلوم تھا اپنی زباں بھی بے زباں ہوگی

قریبِ منزلِ جاناں، پہنچ ہی جائیں گے اک دن
نہیں ہیں وہ مگر ان کی ہی گردِ پا نشاں ہوگی

امیرؔ ہر اک کی الفت کا الگ انداز ہوتا ہے
ہماری وحشتِ دل، عشقِ مجنوں میں کہاں ہوگی

۵۶۔ غزل

اذنِ رفوئے دامنِ ہستی اگر ملے
زخموں کے کچھ نشان تو خونِ جگر ملے

کاوش کو میری دولتِ فکر و نظر ملے
میری سخنوری کو بھی دادِ ہنر ملے

بہلا لیا یہ کہہ کے دلِ سوگوار کو
کشتی کے ہر سوار کو مد پُرخطر ملے

حُسنِ طلب بھی راس جو آئے تو کسطرح
کیسے بُجھے گی پیاس نہ ساقی اگر ملے

بدلا ہوا تھا اُس کے خد و خال کا بھی رنگ
مُدّت کے بعد ہم جو برنگِ دِگر ملے

بارش کے اس پُھوار میں کوئل ہے کوکتی
ساقی پلا جو ابر کا دامانِ تر ملے

اب تو فلک کے ٹوٹتے تاروں پہ ہے نظر
ہستی کے اس شباب کو اذنِ سفر ملے

جس ہمنوا کی مجھ کو رہی عُمر بھر تلاش
اُس ہم نوا سے کیوں کوئی آشفتہ سَر ملے

کافی نہیں ہے جس کے لئے عُمرِ خضر بھی
دو دن کی زندگی میں کہاں وہ ہنر ملے

"مقطع میں آپڑی ہے، سخن گسترانہ بات"
یعنی امیرؔ، خاطرِ دل کو اثر ملے

۵۷۔ غزل

دوست بھی ہو کے سب انجان بدل جاتے ہیں
بدلیں حالات تو انسان بدل جاتے ہیں

اجنبی ہوتی ہے ہجرت سے وطن کی خوشبو
گھر کے کتبے، در و دیوان بدل جاتے ہیں

ملنے جُلنے سے ہے مانوسِ صحبت باقی
پیار کے وعدے و پیمان بدل جاتے ہیں

چارہ گر سے ہو رفو، چاک جگر کا کیونکر
وحشتِ دل سے تو اوسان بدل جاتے ہیں

وقت و حالات سے انسان بکھر جاتا ہے
بیم آشوب سے ایمان بدل جاتے ہیں

ہے یقیں تیری محبت کا اُو جانے والے
پھر بھی ڈرتا ہوں کہ پیمان بدل جاتے ہیں

دُھندلے ہو جاتے ہیں آنکھوں میں سمائے چہرے
دل کے افسانوں کے عنوان بدل جاتے ہیں

☆☆☆

ابیات

رہتی انھیں سے تھی یہاں رنگینئ حیات
وہ جو گئے تو رونقِ محفل بکھر گئی

☆☆☆

جانتے تھے زندگانی ہے یہی دو چار دن
پھر بھی ہم نے قدردانی وقت کی سیّد نہ کی

☆☆☆

۵۸۔ غزل

ادائے حُسنِ گلگوں سے مرا خُونِ جگر کیوں ہو
تڑپنا ہی جو ٹھہرا، صبر کا دل میں گزر کیوں ہو

ادائے خُسرَوانہ دُور سے ہم کس لئے دیکھیں
بُتوں کی بارگاہِ ناز پر دریوزہ گر کیوں ہو

اَزل سے ہے تلاشِ حُسنِ کامل چشمِ حسرت کو
مری نظروں نے کیا دیکھا، بھلا اسکو خبر کیوں ہو

ہمارے دیکھنے پر بندشیں ایسی لگائی تھیں!
تو مہکے زُلف کیوں، رُخسارِ لالہ پردہ ور کیوں ہو

نہ کھڑکی میں کھڑے ہو اسطرح سے نیم وا ہو کر
نہ پردہ ہو اُدھر، تو پھر ادھر نیچی نظر کیوں ہو

نہیں منّت کشِ دانش اگر عُنوان ہستی کا
زمیں و آسماں کیوں ہیں، یہ رُودادِ بشر کیوں ہو

یہ کاسہ حسرتوں کا راہِ اُلفت میں رہا خالی
دُعا کا جو نہیں پہلے ہوا، تو اب اثر کیوں ہو

☆☆☆

ابیات

ملا کوئی نہ مجھے جس کو ہمسفر کہتا
مقام ہوتا جو منزل، نہ اس سے گزرا میں

☆☆☆

گو جانتا ہوں وعدۂ فردہ کی حقیقت
یا رب تیرے وعدوں کا سہارا نہیں جاتا

☆☆☆

۵۹۔ غزل

جتنی کوشش بھی کروں تجھ کو بھلانے کے لئے
یاد اُتنی تری آتی ہے ستانے کے لئے

کوئی ظالم تھا، ترا عطر لگا کر گزرا
خوشبو دیتی ہے ہوا آگ لگانے کے لئے

شمع خاموش ہوئی، جل بھی چکے پروانے
صبح آئی ہے اِدھر ہم کو سُلانے کے لئے

بند آنکھیں جو کروں، خواب میں آجاتے ہیں
دل میں رہتے ہیں مرے دل کو دُکھانے کے لئے

ایک ہم تھے کہ تیری یاد سے وابستہ رہے
ایک تم تھے کہ جئے سارے زمانے کے لئے

انتساب

یہ کتاب میں اپنی پوتیوں، حنا زہرا اور علینہ زہرا اور اپنے نواسوں، نجف، سُہیل اور میکائیل کو معنون کرتا ہوں، اس امید میں کہ ایک دن وہ اُردو زبان کی عظمت اور خوبصورتی سے روشناس ہو کر اپنے دادا/ نانا کی اس حقیر کوشش کو پڑھیں گے اور اس طرح دورِ رفتہ کی اُس تہذیب اور ادب سے واقف ہونگے جو وقت کے ہاتھوں فنا ہو چکا ہوگا۔

I dedicate this book to my grand children, Hina Zehra, Alina Zehra, Najaf, Sohail, and Mikail who will, I hope, one day study and understand the beauty and magesty of Urdu language and read this book to reflect on a time and civilization that would have gone with the wind. Dated, Sept 20, 2009.

قطعہ تاریخ بعملِ تدخلہ

(از: محسن عرفی حیدر آبادی)

کلامِ امیر از کلامِ ضمیر
امیرِ سخن شاعرِ بے نظیر
ہو بُگرہ بھی شامل تو عرفی کہو
بہ رنگِ دگر است شعرِ امیر

۲۰۱۰ء

دیدۂ حسرت

اپنے دیدار کو کچھ دیر ذرا رہنے دو
اک جھلک دیدۂ حسرت کو کہاں کافی ہے
مدّتوں سے نہیں دیکھا ہے ترا حسنِ جمیل
وہ تری پہلی جھلک دل میں مرے باقی ہے

نقش جو چھوڑ گیا تھا وہ نہیں مٹتا ہے
دل کے بہلانے کو کیا کچھ نہ کیا ہے میں نے
سوچتا ہوں کہ تری ایک ادا پر کیسے
اپنی ہستی کو ترا نام دیا ہے میں نے

☆☆☆

کتنی تاریک سی اس قبر کی تنہائی ہے
کوئی آیا نہ ادھر شمع جلانے کے لئے

دردِ دل اپنا امیرؔ کس کو سنانے جاتا
لوگ ملتے ہیں یہاں ہنسنے ہنسانے کے لئے

منزلِ عشق سے جو گزرے، وہی جانے امیرؔ
دردِ دل کا نہیں دنیا کو دکھانے کے لئے

☆☆☆

ابیات

ایک تنہائی کا غم اور ایک احساس خلا
ابر طوفاں ہے جو دل پہ مرے چھایا ہے

☆☆☆

وقت و زماں کا، گردشِ دوراں کا کیا کروں
ہستی کے بیت جانے کا، کس سے گلہ کروں

☆☆☆

۶۰۔ غزل

اب بھی جلتا ہے مرے دل میں محبت کا چراغ
اب بھی گہرے ہیں کبھی اس نے لگائے تھے جو داغ

اب بھی ہر رات تصور میں تو آجاتا ہے
میں نے پایا ہی نہیں دردِ محبت سے فراغ

زندگی بھر نہ ملا مقصدِ ہستی جس کو
کیا وہ پائے گا زمانے میں حقیقت کا سُراغ!

دشتِ ہستی میں فسوں ساز ہے نظروں کا سراب
سبز رہتا ہے خزاؤں میں بھی امید کا باغ

تو پلاتا ہے تو پینے میں مزا آتا ہے
ورنہ رہتے ہیں یونہی سامنے مینا و ایاغ

سلسلہ میرے شب و روز کا پوچھو نہ امیرؔ
دیکھو طوفاں میں لرزتا ہوا شوریدہ چراغ

☆☆☆

۶۱۔ غزل

تسبیح کے ساتھ ساتھ یہ پیمانہ کس لئے
سجدے میں شوقِ جلوۂ جانانہ کس لئے

گردش میں پھر رہا ہے یہ دیوانہ کس لئے
شعلے پہ جل رہا ہے یہ پروانہ کس لئے

پاؤں جو ڈگمگائے تو کہنے لگے یہ شیخ
مسجد کے راستے میں یہ بُت خانہ کس لئے

داڑھی میں تنکا دیکھ کے گھبرا کے بولے وہ
آئینہ رکھ کے کرتے ہو دیوانہ کس لئے

جب زندگی میں پوچھا نہیں میرا تو نے حال
مرنے پہ میرے اشک پشیمانہ کس لئے

بھولو نہیں کہ ذیل فقیراں سے ہو امیر
انداز خسروانہ، امیرانہ کس لئے

۶۲۔ غزل

آدمی گشتۂ آلامِ پریشاں کیوں ہے
زندگی کیا ہے بتا، گردشِ دوراں کیوں ہے

تھا کبھی لالۂ و گُل سے یہ گلستاں آباد
آج پھر وہ ہی چمن، منظرِ ویراں کیوں ہے

کوئی مقصد تھا کہ آدم کو بنایا تو نے
گر بنایا تھا تو انسان پریشاں کیوں ہے

اپنی ہستی کی نہ پائی کبھی وسعت لیکن
ہر کرن قطرۂ شبنم میں درخشاں کیوں ہے

تجھ سے کرتا نہ شکایت تو میں کس سے کرتا
میری آوازِ تجسُّس پہ تو حیراں کیوں ہے

موت کے بعد کُھلا مجھ پہ یہ عُقدہ اے امیرؔ
عالمِ ہجر میں یہ رات درخشاں کیوں ہے

([illegible])

۶۳۔ غزل

یہ تجربات بھی دنیا میں نئے اپنے تھے
درد ان سے ہی ملا جو کہ مرے اپنے تھے

تھا بہت ناز مجھے اپنی وفا پر لیکن
آتشِ عشق سے جو ہاتھ جلے اپنے تھے

پھر مٹانے پہ مجھے کیوں ہے یہ اصرار فلک
تجھ کو معلوم ہے اک ہم ہی ترے اپنے تھے

کس لئے آگ لگاتا ہے چمن میں صیاد
جتنے بھی پھول گلستاں میں کھلے اپنے تھے

راہِ ہستی میں مرا کوئی شناسا نہ رہا
سوئے منزل بھی دو چار چلے، اپنے تھے

سازشیں ساتھ عدو کے مری بربادی کی
اک زمانہ تھا کبھی ہم بھی ترے اپنے تھے

ہم نے مانا کہ شکایت تو بہت ہے تم کو
ہم بھی کہنے پہ جو آتے تو گلے اپنے تھے

آتشِ گل سے سُلگنے لگا جب خود گلشن
ہاتھ جو آگ بُجھانے میں جلے، اپنے تھے

جب بھی آتا ہے کوئی تیر مری سمت امیرؔ
ناوک انداز جو دیکھے تو مرے اپنے تھے

(یہ غزل [illegible])

☆☆☆

۶۴۔ غزل

وہ زلفوں سے دل کو جہاں باندھتے ہیں
لگا جیسے خود پاسباں باندھتے ہیں

زمیں پر کبھی نا حسن پا سے اپنے
لحد کا وہ میری نشاں باندھتے ہیں

سیہ پوش زلفیں پریشاں، پریشاں
اداسی کا کیسا سماں باندھتے ہیں

حیات اس طرف ہے، اجل اس طرف ہے
مجھے دونوں کے درمیاں باندھتے ہیں

نہ پوچھو کہ جو اولا دیا تھا غزل کو
گرہ اس پہ اب مہرباں باندھتے ہیں

رہائی سے اچھی ہے میری اسیری
مجھے وہ بہ رُوئے مکاں باندھتے ہیں

میں کرتا ہوں جب گفتگو کی جسارت
اشاروں سے میری زباں باندھتے ہیں

([illegible])

☆☆☆☆

ابیات

کیا بُود و باش، نام و پتہ پوچھتے ہو یار
کس کو خبر میں کون ہوں، آیا کہاں سے ہوں

☆☆☆

دیکھا جو آئینہ میں تو پوچھا یہ نقش سے
تو کون ہے؟ تو کیا ہے؟ یہاں کر رہا ہے کیا؟

☆☆☆

۶۵۔ غزل

آئینہ رکھ کے سامنے، حیراں ہوا ہے دل
دیکھا جو حال اپنا، پشیماں ہوا ہے دل

بجھتی نہیں کسی بھی طرح حسرتوں کی آگ
سوچا ہے جتنا، شعلہ بداماں ہوا ہے دل

بھولے سے یاد آیا ہے جب اس کا پیرہن
خوشبو سے خود بھی رشکِ گلستاں ہوا ہے دل

کانپے ہیں ہاتھ دیکھ کے خط اُن کا سامنے
تحریر پڑھ کے اور پریشاں ہوا ہے دل

پلکوں پہ انتظار کی شمعیں سُلگ اُٹھیں
یاد آئی جب بھی تیری، غزل خواں ہوا ہے دل

کالی گھٹا میں جیسے چمکتا ہے ماہتاب
ظلمت میں غم کی اور درخشاں ہوا ہے دل

میں ہوش میں رہا نہ امیرؔ اُن کے سامنے
منزل کے پاس بے سروساماں ہوا ہے دل

☆☆☆

ابیات

آسماں پر برق و باراں، رحمتِ یزداں چلا
رخصتِ گرما پہ زورِ گردشِ طوفاں چلا

☆☆☆

مزاج پُرسی کو آتے ہیں یوں تو یار میرے
جس نے بیمار کیا وہ ہی نہ آیا ملنے

☆☆☆

اے میرے دوست

اے مرے دوست، میرے مونس و غمخوار و حبیب
راحتِ جان و جگر، ہمسفرِ ماہ و سال
تجھ کو میں کیسے بتاؤں کہ جلاتی ہے مجھے
تیری غماز نگاہیں، ترا افسردہ جمال

آؤ بیٹھو تو ذرا دیر کو باتیں کر لیں
ہم زباں، مونس و غمخوار کہاں ملتے ہیں
درد کا تیرے میرے پاس مداوا تو نہیں
مل کے ہم اشک بہا لیں، یہ تو کر سکتے ہیں

۶۶۔ غزل

بیٹھیں ہیں رہ گزر پر، سایا ہے آسماں کا
مطلب نہیں کسی سے، کیا واسطہ جہاں کا

روکے ہے ہم کو زاہد پینے سے کیوں بھلا اب
یہ کوئی اُس سے پوچھے دستور ہے کہاں کا

میں پوچھتا ہوں تجھ سے بھیجا بھلا کیوں مجھکو
جب درد سے بھرا ہے یہ راستہ جہاں کا

ہم خاکسار بندے رہتے ہیں گو زمیں پر
دل میں چھپا ہوا ہے ہر راز آسماں کا

اس زندگی کا مقصد یا رب مجھے بتا دے
کیوں سلسلہ ہے جاری، ہر روز امتحاں کا

۶۷۔ غزل

تیرگی رات کی جب حد سے نکل جاتی ہے
روشنی دامنِ لیلیٰ میں مچل جاتی ہے

دل سے گھبرا کے کبھی آہ نکل جاتی ہے
اتنے اوہام ہیں کہ رُوح دہل جاتی ہے

کبھی کھلتے ہیں خطاؤں سے عطا کے رستے
زیست لغزش کے سہاروں سے سنبھل جاتی ہے

دیکھتے ہیں مری جانب وہ پشیمانی سے
گفتگو جب لبِ خاموش میں ڈھل جاتی ہے

کس قدر پاسِ محبت ہے جنوں کو میرے
نام لیتا ہوں تو آواز بدل جاتی ہے

اک اُجالا سا اندھیروں میں نظر آتا ہے
زندگی ملنے کو جو سوئے اجل جاتی ہے

(یہ غزل فقہ عراقی کے لئے لکھی گئی ہے)

☆☆☆

۶۸۔ غزل

تھا میں محفل میں، مگر تنہائیاں بھی ساتھ تھیں
دل لگی کے درمیاں بچپنیاں بھی ساتھ تھیں

پاش ہوتے میں نے دیکھا ہے یقین کو بار بار
کامرانی کے پس ناکامیاں بھی ساتھ تھیں

بات جو کہنی نہ تھی وہ آ گئی تحریر میں
نام تو میرا ہوا، رسوائیاں بھی ساتھ تھیں

دیکھ کر اُس فتنہ پرور کو مچل جاتا تھا دل
رُک کبھی جاتا، کبھی بیباکیاں بھی ساتھ تھیں

نہ ملی کوئی خوشی، بے داغ جو ہوتی امیرؔ
ہر خوشی میں درد کی پرچھائیاں بھی ساتھ تھیں

۶۹۔ غزل

ہر خوشی دل سے بہت دُور ہوئی جاتی ہے
زندگی درد سے معمور ہوئی جاتی ہے

جس طرف آنکھ اُٹھاتا ہوں ترے جلوے ہیں
شامِ غم بھی مری پُر نور ہوئی جاتی ہے

کب سے بیٹھیں ہیں نگاہوں کو لگائے در سے
شمعِ امید کی بے نور ہوئی جاتی ہے

نسبتِ غم سے یہ حاصل تو ہوا اُلفت میں
میری رُسوائی بھی مشہور ہوئی جاتی ہے

دیکھتے کیا ہو اِدھر آئے گا کوئی نہ امیرؔ
شب فرقت شب دیجور ہوئی جاتی ہے

(یہ غزل [illegible])

☆☆☆

۷۰۔ غزل

اپنے خیال و خواب میں کس کو بسا دیا
ایک عالمِ سکوت میں ہل چل مچا دیا

کیسا فسوں ہے، چھائی ہے کیسی یہ بے خودی
محوِ خیالِ یار میں خود کو بھلا دیا

جس گلستاں کو اس نے سجایا تھا شاخ شاخ
ہاتھوں سے اپنے خود اُسے پھر کیوں جلا دیا

واقف نہیں تھا عشقِ بُتاں سے مگر امیرؔ
اس کی ادا نے سوزِ محبت جگا دیا

(یہ غزل قوالی کے لئے لکھی گئی ہے)

بیتنا

نکلے صمیمِ قلب سے جو شعر پُر اثر
انساں کے دل میں جا کے وہ کرتا ہے اپنا گھر

۷۱۔ غزل

ارے شکوہ گو، ارے نکتہ چیں، ذرا مری بات بھی سُن تو لے
ان شکایتوں سے ملے گا کیا، ان شکایتوں سے تو دل جلے

تو ہے اپنی ذات میں منہمک، تجھے اپنی جان و انا عزیز
کبھی دوسروں کی بھی بات سُن، کبھی دوسروں کو بھی پیار دے

تجھے ہر بشر سے ہے کیوں گلہ، کبھی اپنی فکر و عمل بھی دیکھ
جو مٹائے اپنے ہی آپ کو، وہ کیوں دوسروں کا گلہ کرے

مرے دل کی دل ہی میں بس رہی، نہ سکون محرم جاں ملا
مری یوں امیرؔ ہے کٹ رہی، حد جاں سے تاحد جاں چلے

☆☆☆

بیت

ہر ابتدا کی ہوتی ہے دنیا میں انتہا
دائم وہی ہے جس کی نہیں ہوتی ابتدا

☆☆☆

۲۔ غزل

بات جانے کیا ہوئی، کس نے کہا، کیا ہو گیا
بیٹھے بیٹھے اُٹھ کے محفل سے وہ کیوں جانے لگا

اُس کے جانے پر زمانہ کیوں بھلا دیکھے مجھے
کس لئے الزام یارو میرے سر آنے لگا

وقت نے کچھ اس طرح سے پھیر دی میری نظر
پہلے فردا پر تھی اب ماضی نظر آنے لگا

عہدِ رفتہ کے بیاں میں آ گیا جو میرا نام
سوچ کے وہ جانے کیا کیا آپ مُسکانے لگا

موت نے جب کان میں آ کر کہا چلیو امیرؔ
ایک چھوڑا گھر، بسانے دوسرا جانے لگا

(یہ غزل فلم والوں نے لے لی ہے)

☆☆☆

۷۳۔ غزل

ساقیا وا درِ خُمخانہ رہے شام و سحر
جُھومتا پھر کوئی آجائے نہ مستانہ اِدھر

تجھ کو ہی بات مرے دل کی میں سمجھا پاؤں
میری وہ بات نہیں جس کا زمانے پہ اثر

رونقِ محفلِ یاراں بھی رہے تا بہ سحر
منتشر ہوگئے دُو چار جو آئے تھے اِدھر

مجھکو بے ہوش اور بیگانہ ابھی رہنے دے
قیدِ آفاتِ زمانہ سے ملے کچھ تو مفر

مُلتہب شعلۂ ہستی کو ذرا ہونے دے
دامنِ حُسن سے اُٹھتا ہے جوانی کا شرر

کس سے کہتا ہے امیرؔ کس کو سناتا ہے تو
تیری باتوں کا نہیں ہوگا زمانے پہ اثر

(یہ غزل نجمہ رانی کے لئے کہی گئی ہے)

☆☆☆

۷۴۔ غزل

وہ ہاتھوں سے چھینیں نہ بادہ ہمارے
جئے جا رہے ہیں اُسی کے سہارے

غمِ زندگی کو بُھلانا ہے ساقی
نہ اب روکنا ہم کو کر کے اشارے

نکل تو گئے بحرِ ہستی میں لیکن
ہے کشتی شکستہ، ہیں طوفاں کے دھارے

خدا سے دُعا، ناخدا کو دُعا دی
جو ڈوبا سفینہ پہنچ کر کنارے

([illegible])

۷۵۔ غزل

ژولیدگی خزاں کی جو پھیلی چمن میں ہے
ہر پنکھڑی پہ شبنمِ گریاں سمن میں ہے

پہلا سا وہ خلوص نہ آداب و طور ہیں
اندازِ گفتگو بھی نرالا وطن میں ہے

تاروں کی ضو سے میں نے سنوارا ہے شعر کو
ذوقِ ادب کا چاند بھی لیکن گہن میں ہے

اپنی شکایتوں سے نہ محجوب ہو امیرؔ
دیکھو، دلِ فغاں تو ہر اک نسترن میں ہے

([illegible])

پیاز

ابتدائے موسمِ گرما کا دور
آگیا تھا آم پر پھولوں کا بور

صحن میں بیٹھا ہوا میں وقتِ شام
محو تھا آرام میں بعدِ خرام

تخت تھا اور کُرسیاں بچھی ہوئی
بیچ میں اک میز تھی رکھی ہوئی

صحن میں پانی جو تھا چھڑکا ہوا
سوندھی سوندھی تھی ہوائے دلربا

پڑھ رہا اخبار تھا کھویا ہوا
شام کا ماحول تھا سویا ہوا

چل رہی ہولے سے تھی بادِ دَبور
ہوگئے خاموش تھے مرغ و طیور

۷۶۔ غزل

بیٹھے بیٹھے مسکرا دیتے ہیں وہ
کھوئے کھوئے آج کل رہتے ہیں وہ

مجھ سے مِلنے کے لئے آئے نہ تھے
جاتے جاتے رُک کبھی جاتے ہیں وہ

پوچھنا اُن کو بہت کچھ تھا مگر
کہتے کہتے کیوں اُلجھ جاتے ہیں وہ

رُخ پہ جو بکھری ہوئی رہتی تھی زلف
اک ادا سے اب ہٹا دیتے ہیں وہ

ہنس کے کوئی پوچھتا ہے ان کا حال
دل میں دردِ عشق ہے، کہتے ہیں وہ

باغ میں پھرتے ہیں وہ اک ناز سے
پھول بالوں میں لگا لیتے ہیں وہ

آئینے میں دیکھ کر خود آپ کو
شرم سے گلگوں ہوئے جاتے ہیں وہ

دوش سے جب اوڑھنی گر جائے بے
بے خبر، کچھ باخبر ہوتے ہیں وہ

بے نیازی کے بھی کچھ انداز ہیں
دیکھ کر ہم کو کبھی ہنستے ہیں وہ

عشق کی قسمت میں درد و غم رہے
حسن لاپروا رہا، کہتے ہیں وہ

(یہ غزل نغمہ سرائی کے لیے لکھی گئی ہے)

☆☆☆

۷۷۔ غزل

پھول یادوں کا خیالوں میں مہکتا جائے
دیدۂ حسرتِ بے خواب چھلکتا جائے

دل دیوانہ محبت میں بہکتا جائے
زندگی کا میری شیرازہ بکھرتا جائے

شعلۂ عشق سیاہ پوش کہاں ہوتا ہے
شام ہوتی ہے تو یہ اور بھڑکتا جائے

منفردِ غم نہیں تیرا کہ اسی محفل میں
اک چراغِ شبِ خاموش بھی جلتا جائے

ابتدا میں جو قدم جانبِ منزل نہ اٹھے
آگے چل کر وہ قدم اور بھٹکتا جائے

۸۷۔ غزل

چھب اسکی پسِ پردہ نظر کرنے کو کیوں ہو
اک نقشِ حسیں دل پہ اثر کرنے کو کیوں ہو

دیوار کا ٹیکہ ہے تو سایا ہے شجر کا
ہوں چین سے منزل پہ، سفر کرنے کو کیوں ہو

جائے جو میرا قافلہ آگے کو، تو جائے
منزل سے پرے کوئی سفر کرنے کو کیوں ہو
([illegible])

☆☆☆

۷۹۔ غزل

یاد کیا کیا تھا، رہا یاد نہیں، بھول گئے
جو خزاں آئی، چمن زار گئے، پھول گئے

دل کسی بات میں اے یار نہیں لگتا اب
وہ جوانی جو گئی، عشق کے معمول گئے

ہاں ملے موڑ کئی، ہم کو بھٹکنے کے لئے
پھر بھی ہم راہ پر مثبت و معقول گئے

لو لگا دی سرِ ساحل میری کشتی میں نے
آندھیوں میں جو نکلنے کے تھے مشغول گئے

اب بھی رُک جاتا ہوں بچوں کی صدائیں سن کر
گرچہ مدت ہوئی اے دوستو اسکول گئے

([illegible])

۸۰۔ غزل

آنا ہوگا تو چلے آئیں گے آنے والے
جانا ہوگا تو چلے جائیں گے جانے والے

اپنی مرضی کے جو مختار ہوا کرتے ہیں
ہم بھلا کون ہوئے ان کو بتانے والے

نہ کرو اہلِ بُتاں کے کسی وعدے پہ یقیں
کم ہی کرتے ہیں وفا دل کو لُبھانے والے

خاکِ پروانہ ادھر، اور اُدھر رُوغنِ مُوم
خود بھی جل جاتے ہیں، اُوروں کو جلانے والے

سوسن و جوہی و لالہ و چنبیلی چُن کر
ایک گجرا بھی ہمیں دو، گجرا بنانے والے

شیوۂ عشق نہیں رُوٹھ کے شکوہ کرنا
ناز کرتے ہیں کہاں ناز اُٹھانے والے

اپنے اعمال پہ کر اپنے گناہوں پہ نظر
ساری دنیا کو رہِ راست دکھانے والے
(یہ غزل ضیاء الحق کے لئے کہی گئی ہے)

ابیات

رہتی تھی نائے نوش سے رنگینیِ حیات
ساقی گیا تو رونقِ محفل بکھر گئی

الفاظ کے رنگوں سے ترا نقش و رنگ و روپ
کھینچا بہت، پہ تیری شباہت نہ لا سکا

۸۱۔ غزل

اُس کا اندازِ تغافل ہم کو کیوں بھانے لگا
کیوں ادائے ناز سے وہ اور اترانے لگا

بے نیازی پر تو میری وہ خفا ہوتے نہ تھے
پھر رُخِ روشن پہ غصہ کس لئے چھانے لگا

کس لئے، کیوں اور کیسے، اُس سے ہم کیا پوچھتے
جو بھی دل میں اُس کے آیا، وہ ستم ڈھانے لگا

فیصلہ اپنا تھا یہ نہیں سمجھا امیرؔ
کھیل قسمت کا سمجھ کر دل کو بہلانے لگا

(یہ غزل فوزیہ کے لئے لکھی گئی ہے)

☆☆☆

مسدّسات

لگا رہا ہوں مضامینِ نو کے پھر انبار
خبر کرو میرے خرمن کے خوشہ چینوں کو
(میر انیسؔ)

مسدّس ۱

یہ سلسلۂ گردشِ ایام کہاں تک
یہ سلسلۂ ہستیٔ ناکام کہاں تک
نا کردہ گناہوں کا یہ الزام کہاں تک
یہ خونِ جگر، شورش و ہنگام کہاں تک

کب تک تیری رحمت کے طلبگار رہیں ہم
نہ درد کا درماں ہے نہ زخموں کا ہے مرہم

مسدّس ۲

ایک چھوٹا سا تو ارہ سر چھپانے کے لئے
ایک چھوٹی سی زمین ہو کاشت کرنے کے لئے
ایک ساتھی ہمنوا ہو دل لگانے کے لئے
بس یہی کافی ہے جھاو زندہ رہنے کے لئے

شادمانی کے لئے لازم نہیں ہیں تخت و تاج
مطمئن رہتا ہے دل جو صوفیانہ ہو مزاج

بیٹھے بیٹھے جا پڑی اُن پر نظر
کام جو کرتی تھیں مجھ سے بے خبر

پیاز کی ڈلیاں تھیں، چاقو ہاتھ میں
کچھ کٹی تھالی میں رکھی ساتھ میں

جو عرق اُڑتا تھا کچی پیاز سے
تھیں پریشاں اک عجب انداز سے

چشم تر کو پونچھتی تھیں بار بار
تیز کرتی تھیں کبھی چاقو کی دھار

آنکھ سے جب کچھ نہیں آتا نظر
جھنجھلاتی تھیں وہ سر کو پھیر کر

آنسوؤں سے تھی نمی رُخسار پر
پھول پر شبنم کا جیسے ہو اثر

مسدّس ۳

راہوں کے سنگ و خارِ مغیلاں کا کیا کروں
ان حادثاتِ گردشِ دوراں کا کیا کروں
اس بے کسی کا، اس غمِ پنہاں کا کیا کروں
تنہا ہوں دردِ ہجرِ شبستاں کا کیا کروں

رہزن وہی تھا جسکو سمجھتا تھا ہمسفر
راہِ نجات مجھکو بتاؤ کہ ہے کدھر

مسدّس ۴

ساغر و مینا، مئے ہے، بادۂ دو آتشہ تاب
حسن کامل سے گزرتا ہوا تیرا یہ شباب
گل و گلزار حسیں ہیں، پہ نہیں تیرا جواب
وہ نظر گاہِ حقیقت، تو ادھر تُو ہے سراب

عاق ہے ذوق نظر کو میری تجھ سے گو جلا
لگ گئی دل کو مرے پر یہ محبت کی بلا

مسدّس ۵

میں وہ طوفان ہوں جسے صورتِ پیکار نہیں
ہوں وہ دریا کہ کناروں سے سروکار نہیں
برق ہوں جس کو چمکنے کا ادھیکار نہیں
ایسا بادل ہوں برسنے کو جو تیار نہیں

کبھی ہنس کے، کبھی خاموش اٹھائے ہیں ستم
خوں چکاں گرچہ نہیں، دل ہے میرا پیکرِ غم

مسدّس ٦

بامِ مغرب پہ سیاہی کو جو ڈھلتا دیکھا
زورِ دریا کو سمندر میں بکھرتا دیکھا
جب بہاروں کو خزاؤں میں بدلتا دیکھا
کسی تربت پہ چراغوں کو جو جلتا دیکھا

بُود و نابود کی تشریح کا سوال آتا ہے
اپنی دو روزہ حقیقت کا خیال آتا ہے

مسدّس ۷

اتفاقاً کبھی آجاتی ہے اک موجِ رواں
جس کے دھارے پہ اگر کشتیٔ ہستی ڈالیں
اٹھتے طوفان بدل دیتے ہیں راہیں اپنی
ساحل بنتے ہوئے خود سُوئے سفینہ آئیں

جو تذبذب میں اُٹھاتے نہیں لنگر اپنا
وہ بھٹکتے ہی رہیں، اپنی نہ منزل پائیں

مسدّس ۸

نہ عطر چھڑکیں، گُل و یاسمیں کے دامن پر
قبائے قوسِ قزح پر کریں نہ رنگ ریزی
صبائے شوخ کو نہ درسِ خوش خرامی دیں
کریں نہ چشمِ غزالاں میں سرمہ آمیزی

وہ سادگی سے کریں اپنی جلوہ آرائی
جنھیں ملی ہے خُدا کی طرف سے زیبائی

مسدّس ۹

نیوکلس[۱]، منقلِ اختر ہے مکاں پر اپنے
الکٹراں[۲]، گردشِ محور پہ شکیبائی ہے
شرح، اجزائے عناصر کی جو میں نے کی ہے
ایک تمثیل سی عالم کی نظر آئی ہے

فرق بس ہے جو میاں، اُن کی جسامت کا ہے
ورنہ تشکیل تو ہر دو کی وہی پائی ہے

مسدّس ۱۰

خود فریبی سے ہیں دنیا کے مسائل قائم
ہو کے کج فہم کریں اپنی نہ ہستی برہم
زخم و ناسور کا مل جائے گا تمکو مرہم
تجزیہ اپنے عمل کا جو کریں گے باہم

وہی عاقل ہے جو بے عیب خدا کو جانے
کر کے تسلیم گناہوں کی معافی مانگے

Electron ۲ Nucleus ۱

مسدّس ۱۱

برگِ گُل پر جو کبھی قطرۂ شبنم دیکھا
صورتِ بیضہ نما، گنبدِ عالم دیکھا
حُسنِ قدرت میں ترا نقشِ مجسّم دیکھا
ذرہ ذرہ میں کبھی نیّرِ اعظم دیکھا

دیکھی نقطہ میں کبھی ہم نے جہاں کی وسعت
کبھی پھولوں میں نما تیرے ہنر کی رفعت

مسدّس ۱۲

فکرِ اشعار میں نغموں کی برستی شبنم
شب کی خاموشی میں لکھنے سے ہے آوازِ قلم
رنگ جذبات سے الفاظ کی محفل کا بھرم
ہوتے شاعر نہیں تنہا سو اکیلے نہیں ہم

کُنجِ تنہائی میں یوں برسوں گزارے ہم نے
توڑ کر رکھ دیئے سب جھوٹے سہارے ہم نے

مسدّس ۱۳

بط نے ماہی سے کہا، ہو نہ پریشاں کہ شتاب
ختم ہونے کو ہے کچھ دیر میں گرمی کا عتاب
ابرِ باراں سے برسنے کو ہے اب رحمت آب
پھر چھلک جائیں گے تو دیکھ یہ سُوکھے تالاب

جاں بلب ماہی نے بط سے یہ کہا ''میرے بعد
منیہہ برسے بھی تو کیا، سُوکھا جہاں ہو آباد''
(نوٹ:۔ فارسی کے شعر کا ترجمہ)

مسدّس ۱۴

کبھی تھا اہلِ زباں، ریختی زباں اپنی
کبھی تھا طرزِ تکلّم، بیاں سبھی اپنا
مگر نہ بول سکوں، وہ زباں جو اپنی تھی
وطن سے دُور جو کوئی رہا نہی اپنا

نہ نکلے آہنگِ پُر سوز و ساز، بربط سے
مسک جو جائے کوئی تار سُر کے مہبط سے

مسدّس ۱۵

قسمت سے ملے ہے اچھی شکل
بہتر ہے مگر ہو فہم و عقل
اس سے بھی اہم ہے جوشِ عمل
محنت کا نہیں پر کوئی بدل

سب کچھ ہے عبث، ایماں جو نہ ہو
حیواں نہ ہوا ! انساں جو نہ ہو

مسدّس ۱۶

تاریخ کائنات میں حرف دوام ہو
شعر و ادب میں حُسنِ تغزل کا نام ہو
رنگِ سحر ہو، رونق محفل بہ شام ہو
چھلکے خمار جس سے وہ جام مدام ہو

اسرار ہو، معمّہ ہو، مثلِ گہر ہو تم
لالہ چمن کا ہو کبھی، لعل و گہر ہو تم

مسدّس ۱۷

ساغر و مینا ہے، ہے بادۂ دو آتشہ ناب
حُسنِ کامل سے گزرتا ہوا تیرا یہ شباب
گُل و گلزار حسیں ہیں، پہ نہیں تیرا جواب
وہ نظر گاہِ حقیقت، تُو ادھر نقشِ سراب

ملتی ہے ذوق نظر کو میری تجھ سے ہی جلا
تجھ سے مل کر ہی مجھے گنجِ گراں مایہ ملا

مسدّس ۱۸

خواب کی ہو یا کسی خواب کی تعبیر کی بات
زُلف کی ہو کہ کسی طوق کی، زنجیر کی بات
ہو کسی زخم کی یا ہو کسی اکسیر کی بات
ہو شبِ ہجر کی یا ہو کسی دل گیر کی بات

شعلۂ شعر سے میں بزم چراغاں کر دوں
دل کو تفسیدہ تو ماحول کو تاباں کر دوں

مسدّس ۱۹

مشاعرے میں ایک دوست شاعر کے تعارف میں یہ مسدّس لکھا گیا تھا

تیرے نغمے بڑے تابندہ، پائندہ بھی
تُو اک شاعر بھی، مفکر بھی اور ایک بندہ بھی
ایک تہذیب بھی ھے، اور اُس کا نمائندہ بھی
ماضی بھی، حال بھی ہے، قصہء آئندہ بھی

اخگرِ فکر کو تو شعلہ بداماں کر دے
پست کو کر دے بلند، اَدنا کو عرفاں کر دے

☆☆☆

قطعات

ایک بھینی سی ہنسی، اک ہچکچاتا سا سلام
ایک تمہیدِ تعارف کی جھجکتی کوشش
خواہشِ دید میں اُٹھتی تھیں بہکتی آنکھیں
تھی رگِ جاں میں امنڈتی ہوئی خوں کی یورش

کچھ جھلک آئی تھی سُرخی گال پر
عمر کے اثرات بھی تھے خال پر

منہمک کاموں میں تھیں وہ اس طرح
لکھ رہا ہو نظم شاعر جس طرح

کام کی جلدی میں وہ گھبرائے ہیں
روئے رنگیں پر تھکن کے سائے ہیں

وقت پر تکمیل ہو ہر کام کی
فکر تھی شاید طعامِ شام کی

اِن ہی فکروں میں ہوئی اُن کی بسر
جب سے لایا تھا میں اُن کو اپنے گھر

چار دیواری میں صبح و شام کی
زندگی بس اس طرح سے کاٹ دی

قطعہ ۱

ابر باراں میں آفتابِ سحر
لگتا جیسے کہ ماہِ کامل ہو
کوئی گلنار جیسے شرمائے
جبکہ چہرے پہ اُس کے آنچل ہو

قطعہ ۲

فنا سے ڈر نہیں مجھ کو، یہ خوف لاحق ہے
اجل کی راہ میں ملتا ہے دشتِ پیری بھی
میں کانپ جاتا ہوں اُس وقت سے کہ جب ہوگی
عصا بہ دست اور دنیا کی دست گیری بھی

قطعہ ۳

کچھ نہ حاصل ہوا حجت سے تری، اے اقبالؔ
خون بہتا ہے مسلماں کا مسلمانوں سے
ذکر ہوتا ہے جہاں پند خودی کا تیری
کرتے سازش ہیں وہاں مل کے وہ کفاروں سے

قطعہ ۴

جبکہ حالات بدلنے کی ہے طاقت مجھ میں
اُن کو معبود بدلنے کی تو ہمت دے دے
جبکہ حالات رہیں قابو سے میرے باہر
ایسے حالات میں جینے کی ہدایت دے دے

قطعہ ۵

نیند سے بوجھل ہیں آنکھیں، آنکھیں و نیم وا
سانس بھی مائل نہیں اب میری چلنے کے لئے
ہو چلی ہے نبضِ ہستی اسطرح سے سُست گام
دھندلکا بڑھتا ہے جیسے شب میں ڈھلنے کے لئے

قطعہ ۶

کوئی حیات نہیں عشق کی حیات کے بعد
کوئی مقام نہیں دل کی کائنات کے بعد
نظر اُٹھی نہ کسی پر بھی دیکھ کر تجھ کو
جچی نہ بات کسی کی بھی تیری بات کے بعد

قطعہ ۷

بیٹھا ہوں مدّتوں سے گم گشتہ رہ گزر پر
ہے انتظار جس کا، پہچانتا نہیں ہوں
دیکھا ہے دُھندلا دُھندلا خوابوں میں اُس کا چہرا
لیکن یہ کون ہوگا، میں جانتا نہیں ہوں

قطعہ ۸

سانولے پن میں سموئی لبِ شیریں کی مٹھاس
عطر و عنبر میں ہے بھینی سی پسینے کی باس
تیرے رُخ پہ جو بکھرتی ہے یہ زُلفوں کی گھٹا
لمس کو تیرے ترس جاتا ہے میرا احساس

قطعہ ۹

جس طرح بادلوں کے گھونگھٹ سے
کرنیں سورج کی چھن کے آتی ہیں
تیری پلکوں کی اوٹ سے اکثر
نظریں خود نور بن کے آتی ہیں

قطعہ ۱۰

خنجر سے نہ برچھے سے، نہ تلوار سے حاصل
شدّت سے، تشدد سے، نہ پیکار سے حاصل
جو مصلحت اندیش ہوں، ہوتی ہے ترقی
ہوتا ہے جو شیرینیٔ گفتار سے حاصل

قطعہ ۱۱

عکس اُن کا جو کبھی دل میں اُبھر آتا ہے
دُھندلا احساس حقیقت میں بدل جاتا ہے
سوچتا ہوں میری یادوں کو جگا کر پھر سے
جانے یہ وقت مجھے کس لئے تڑپاتا ہے

قطعہ ۱۲

نقش دُھندلے ہیں یہاں اور ہیں سائے مدّھم
اَبر آلود فضائیں ہیں تصوّر میں صنم
نیند کی گود میں آباد ہے اک خوابِ بُتاں
رخ پہ پھولوں کے چمکتی ہوئی جیسے شبنم

قطعہ ۱۳

تھک کے بیٹی جو میرے پاس کبھی آتی ہے
سر کو شانے پہ میرے رکھ کے جو سُو جوتی ہے
ایسا لگتا ہے مجھے دولتِ کونین ملی
روحِ بیتاب بھی یک گونہ سکوں پاتی ہے

قطعہ ۱۴

امواجِ حوادث میں بہا جاتا ہوں
طوفان و تلاطم سے لڑا جاتا ہوں
تدبیر پہ ایماں تو کیا ہے لیکن
تقدیر کے جھونکوں سے اُڑا جاتا ہوں

قطعہ ۱۵

دن گزرتا ہے، شام ہوتی ہے
عُمر میری تمام ہوتی ہے
ابھی کٹنے لگی ہے تنہائی
ابتدا، اختتام ہوتی ہے

قطعہ ۱۶

جس طرح صبح کو آوارہ کرن سورج کی
شبِ تاریک کے پردوں کو جُدا کرتی ہے
اِس طرح سوئی ہوئی دل میں کسی کی یادیں
ذہنِ شاعر کو نیا نغمہ عطا کرتی ہے

قطعہ ۱۷

بستی بستی پھرتا ہوں میں، رنج والم اک طاری ہے
قسمت میری گردش گردش، حالت میں ناداری ہے
پیہم اُس کے غم کھا کھا کر، دل یہ میرا بھاری ہے
آنکھیں یوں تو سوکھ چکی ہیں، دل کا رونا جاری ہے

قطعہ ۱۸

پیری ہے، جیسے شام کا سورج زوال میں
ہاتھوں میں ارتعاش تو لرزہ ہے چال میں
راہِ عدم میں شورِ قیامت پہ ہے نظر
دوگام اور چلنا ہے اس خستہ حال میں

قطعہ ۱۹

اُٹھو، اے سوئے ہوئے لوگو کہ پھر بادِ صبا
آ کے دروازے پہ رہ رہ کے صدا دیتی ہے
کتنے ہی پھول کھلائے ہوئے آتی ہے یہاں
آمدِ فصلِ بہاراں کا پتہ دیتی ہے

قطعہ ۲۰

غمِ فکرِ دوراں اُٹھائے ہوئے ہیں
محبت میں دھوکے بھی کھائے ہوئے ہیں
خزاں سے ہمیں اب شکایت نہیں ہے
بہاروں کے ایسے ستائے ہوئے ہیں

قطعہ ۲۱

ہم اُن کو رات میں ماہ تمام کہتے ہیں
سحر کو ہم انہیں بادِ خرام کہتے ہیں
ہو دوپہر تو رُخِ لالہ فام کہتے ہیں
ملیں جو شام ڈھلے، روحِ جام کہتے ہیں

قطعہ ۲۲

تیرے خیال کو ہم غرقِ جام کرتے ہیں
کیا جو کام نہیں اب وہ کام کرتے ہیں
عجیب کیفیتِ ہست و بود طاری ہے
سحر کی فکر نہ اب فکرِ شام کرتے ہیں

قطعہ ۲۳

بَیا بناتا ہے جس طرح آشیاں اپنا
یوں لفظ لفظ کے تنکوں کو چُن رہا ہوں میں
وہ تجربات جو دنیا نے مجھ کو بخشے ہیں
اُنہیں سے درد کے نغمات بُن رہا ہوں میں

قطعہ ۲۴

خائف ہیں اتنے بختِ سیہ سے کہ جب نہیں
گھبرا کے دیکھتے ہیں اِدھر کو اُدھر کو ہم
رستے کا ہے نشان نہ منزل کا ہے سُراغ
شوقِ سفر میں جانے چلے ہیں کدھر کو ہم

قطعہ ۲۵

بحرِ خیالِ یار میں ڈوبا ہوا ہوں میں
طُولِ شبِ فراق کا رویا ہوا ہوں میں
خوابوں میں میرے آتے ہیں وہ بار بار کیوں
گھبرا کے جاگتا ہوں کہ سویا ہوا ہوں میں

قطعہ ۲۶

ہم سے نہ حالِ دردِ رگِ جاں کا پوچھئے
آنسو نکل نہ جائیں کہیں اضطراب میں
کیا کیا سنائیں آپ کو محرومیوں کا حال
اک داستانِ غم ہے سب کے جواب میں

قطعہ ۲۷

نقشِ احساس جو مشکل سے عیاں ہوتے ہیں
اپنے اشعار میں پھولوں کی زباں ہوتے ہیں
وہ خیالات جو شرمندۂ اظہار نہیں
نئی ترکیب سے لفظوں میں بیاں ہوتے ہیں

قطعہ ۲۸

اندھیرا شام کو چھاتا ہے، پھر بھی بُرجِ مغرب پر
نمودِ شب سے پہلے اک اُجالا سا چمکتا ہے
محبّت کی جو تھی، اُس حادثے کو گو ہوئے برسوں
ابھی تک دھیمے دھیمے یاد کا شعلہ دمکتا ہے

قطعہ ۲۹

رہے نہ درد تو تحریر میں گداز نہیں
نہیں جنوں تو ہوا عشق کو مجاز نہیں
فروزِ شمع ہو روغن کی کیمیائی سے
نہ ہو جو سوز تو تشبیب کو فراز نہیں

قطعہ ۳۰

شکوہ کریں اگر تو بہت اختصار سے
رنجش بڑھے نہ کشمکشِ بار بار سے
دو راستے ہیں یا تو بنیں اُس کے ہمنوا
یا پھر کہیں کو دُور چلیں کوئے یار سے

میری خواہش اُن کا نصب العین تھا
میری خدمت اُن کے دل کا چین تھا

خون سے سینچا تھا بچوں کو مرے
خدمت و ایثار کے تھے سلسلے

اپنی ہستی کو مٹا ڈالا مگر
فرض پورے کر رہی تھی بے جگر

یوں ہی عورت کی رہیں مصروفیات
یوں ہی عورت کا رہے طرزِ حیات

چھوڑ کر بابل کا گھر آئی تھیں وہ
کتنی خوشیاں ساتھ میں لائی تھیں وہ

ریشمی گھونگھٹ کے پیچھے تھا شباب
[illegible] میں وہ [illegible] ماہتاب

قطعہ ۳۱

جادہ بھی ہو، نشاں بھی ہو، منزل بھی ہو کوئی
ہے جو سفر تو زادِ سفر، مال چاہیے
کرتے ہیں اپنی زیست کو نادان رائیگاں
اک مقصدِ حیات بہرحال چاہیے

قطعہ ۳۲

آنے کو ہیں وہ، بادِ صبا، دستِ ناز سے
لے آ بنا کے صحنِ گلستاں سے ایک ہار
سُنبل ہو، یاسمین ہو، سوسن یا اطلسی
پھولوں سے اُنکی راہوں کو کر دے تو لالہ زار

قطعہ ۳۳

ڈوبتے سورج کو دیکھا میں نے تو آیا خیال
لے گیا یہ پھر سے میری زندگی کا ایک روز
دیکھتا پہلے بھی تھا میں یہ غروبِ آفتاب
کیا ہوا جو میری شامیں ہو گئیں یوں دل فروز

قطعہ ۳۴

ظلمتِ شب میں کوئی گائے ہے راگِ ملہار
چنگ و بربط سے ہے متوالی فضا میں جھنکار
میں دریچے میں کھڑا دیکھ رہا ہوں کب سے
سوئی بستی پہ برستی ہوئی بارش کی پھوار

قطعہ ۳۵

جلوہ گستر ہے نگاہ و قلب پر اُس کا جمال
ڈھونڈتا ہے ساحلِ قرطاس کو سیلِ خیال
ہے قلم کی نوک پر تخلیق کا اک ارتعاش
اور عبارت کی قبا میں ریشمی سا ایک جال

قطعہ ۳۶

جوانی، مثلِ بہاراں زِ باغِ ہستی، رفت
بہ رنگِ فصلِ خزاں دلفریبی مابود
جمالِ منظرِ قدرت ہمیں بہ ہر موسم
نگر بہ چشم زدن فصلِ زندگی نابود

قطعہ ۳۷

آ گئی پھر خزاں، پھر فصلِ گُل جانے کو ہے
آسماں پر پھر اُداسی کا سماں چھانے کو ہے
تھی جوانی، جشنِ ہستی، انبساطِ جان و دل
فصلِ گُل رخصت ہوئی، اب فصلِ غم آنے کو ہے

قطعہ ۳۸

دھیمی سی ہنسی ہے ہونٹوں پر
آنکھوں میں سحر کا رنگِ فسوں
دل میں ہے یقینِ مہر و وفا
چہرے سے عیاں ہے دل کا سکوں

قطعہ ۳۹

دل کو سمجھاتا ہوں اتنا نہ پریشاں ہو تو
ہے یقیں مجھ کو شبِ غم بھی گزر جائے گی
یہی قدرت کا ہے آئین، یہی ہے دستور
ہر خزاں بعد گلستاں میں بہار آئے گی

قطعہ ۴۰

وقت کی موجِ رواں زیست کے ساحل پہ کبھی
ساتھ خاشاک کے، موتی بھی بہا لاتی ہے
میں کنارے پہ اسی سوچ میں بیٹھا ہوں امیر
میری تقدیر میرے سامنے کیا لاتی ہے

قطعہ ۴۱

یہ حال ہے کہ ہمیں خود پہ اعتبار نہیں
کسی بھی بات پہ اب ہم کو اختیار نہیں
یہاں تو ہم کو زمانے نے یوں مسل ڈالا
کہ خود پہ اپنی حقیقت بھی آشکار نہیں

قطعہ ۴۲

اُلجھا رہا میں خود سے زمانے کی ریس میں
ورنہ تھا کچھ بھی کم نہ میری جاں کے واسطے
پایا نہیں ہوس کا کنارا دمِ حیات
سب کچھ عبث تھا روحِ پریشاں کے واسطے

قطعہ ۴۳

کمر کو موڑ کے، ہاتھوں کو اپنے کر کے بلند
سحر کو اُٹھ کے وہ لیتے ہیں جبکہ انگڑائی
میں دیکھتا ہوں گلے مل رہا ہے حسن و شباب
نہ بھول پاؤں گا میں ارتقا کی پرچھائی

قطعہ ۴۴

حُسنِ قدرت کے اِن مناظر کا
ایک نقشہ بنا رہا ہوں میں
اُوج دیتا ہوں عامیانہ کو
بیل بوٹے سجا رہا ہوں میں

قطعہ ۴۵

جلوہ گستر ہیں حُسنِ قلب پر اب تک میرے
دُھندلے دُھندلے اُس کے وہ نقشِ جمال
میں نے مدت سے بُھلا رکھا تھا جسکو امیرؔ
پھر اُبھر آتے ہیں کاغذ پر اسی کے خدّ و خال

قطعہ ۴۶

وہ بھی کیا دل کہ نہیں جس کو دھڑکنا آیا
وہ بھی کیا پھول، نہیں جسکو مہکنا آیا
وہ زبان کیا کہ نہیں جس کو ہو آدابِ بیاں
وہ ہے پروانہ کہاں، جس کو نہ جلنا آیا

قطعہ ۴۷

بدلے حالات تو انسان بدل جاتے ہیں
جو گلے ملتے تھے، پہلو سے نکل جاتے ہیں
کس سے امید وفا، رسمِ رواداری امیرؔ
جب یقیں ٹوٹے تو، اوہام مچل جاتے ہیں

قطعہ ۴۸

کچھ تو تھے حالات اور کچھ میری قسمت کا قصور
آتے آتے پاس میرے ہوگئے وہ مجھ سے دُور
ہے تصوّر میں ابھی تک ان کا وہ حُسن و جمال
اُنکی آنکھوں کی سیاہی اُن کے ابرو کا ہلال

قطعہ ۴۹

نہ تو آس ہے، نہ تو یاس ہے
نہ تو بھوک ہے، نہ تو پیاس ہے
نہ تو درد سے رہا آشنا
نہ خوشی کی مجھکو شناس ہے

قطعہ ۵۰

او صبحِ درخشاں آ، او رشکِ گلستاں آ
او سحر بہاراں آ، او شعلہ بہ داماں آ
آ کے تو میرے شبستاں کو چراغاں کر دے
رُخ پہ بکھرائے ہوئے زُلفِ پریشاں آ

قطعہ ۵۱

ہوں جو اغراض تو ملتا ہے ملنساری سے
نظریں پھر جاتی ہیں، جب کام نکل جاتا ہے
رنگ لاتی ہے جب انسان کی ابن الوقتی
رنگ گرگٹ کی طرح اُس کا بدل جاتا ہے

قطعہ ۵۲

ابنِ آدم کو ہمیشہ ہی پریشاں دیکھا
کبھی روتا ہوا دیکھا، کبھی نالاں دیکھا
ہے عجب بات کہ غم خانۂ دُنیا میں امیرؔ
شوق مرنے کا جسے ہے، وہ نہ انساں دیکھا

قطعہ ۵۳

کیجئے نہ مُدّعا نہ طلبگار ہوئیے
عزّت کو اپنی آپ نہ اس طرح کھوئیے
چاہیں گے اس جہاں میں جو، ضد اسکی پائینگے
دل کو لگا کے پھر نہ پشیماں ہوئیے

قطعہ ۵۴

دل دُکھانا چاہتے ہیں، دل دکھاتے جائیے
ہے جلانا آپ کا شیوہ، جلاتے جائیے
کر کے رُسوا مجھ کو شاید آپ ہونگے نیک نام
جُھوٹ کہتے جائیے، بدنام کرتے جائیے

قطعہ ۵۵

مجھ سے پوچھو ہو بھلا کس لئے اسرارِ فلک
کس نے پایا ہے یہاں مقصدِ ہستی کا سراغ
یوں ہی پھرتے ہیں یہاں لوگ عمامہ پہنے
طاقِ دنیا میں نظر آتا نہیں کوئی چراغ

قطعہ ۵۶

اے بادِ شُرط کر دے ذرا سہل یہ سفر
کشتی شکستہ، ٹوٹا ہوا بادبان ہے
گزری ہے میری ایسی حوادث کے درمیاں
اور ناخدا بھی مجھ سے بڑا بدگماں ہے

قطعہ ۵۷

یوں برائی نہ مرے عام زمانے سے کرو
نام سے میرے ہی دنیا میں ہے پہچان تری
کچھ نہ حاصل ہوا راوی کو کبھی غیبت سے
میری تسخیر سے ہوگی نہ کوئی شان تری

قطعہ ۵۸

دیکھے دریا پہ سرِ شام شجر کے سائے
رات گزری تو ہر اک دامنِ گُل نم دیکھا
کتنی امیدوں کو دیکھا ہے شکستہ ہوتے
دیکھا سب کچھ، پہ اُسے میں نے بہت کم دیکھا

قطعہ ۵۹

ہیں جو آداب نہیں، لطفِ ملاقات نہیں
پیار، اخلاص نہیں، شدّتِ جذبات نہیں
یوں تو ملتے ہیں ہر اک سے ہی ملنساری میں
باتیں کرتے ہیں مگر دل کی کوئی بات نہیں

قطعہ ۶۰

میری بچی نے تجسُّس میں یہ آکر پوچھا
بابا کہیئے کہ اس قرآن میں لکھا کیا ہے
میں نے بتلایا کہ اللہ کا فرمان ہے یہ
ہیں وہ احکام جنہیں کوئی نہیں سمجھا ہے

بھیگ کر آنکھوں سے سُرمہ گال پر
نرگسِ جادو کو کرتا پُر اثر

اَبروئے پُر خم کہ تھے رشکِ ہلال
چہرہ پورے چاند کا جیسے جمال

چہرہ بھی گُل رنگ تھا، رُخسار بھی
شدّت جذبات کے آثار بھی

نُقرہ پا اُٹھتے تھے اس انداز سے
صبح جیسے آ رہی ہو ناز سے

بندیا، جُھمکے تھے کنگن، دلرُبا
مخملی گُلرنگ تھی اُن کی قبا

شرم سے نیچی نگاہیں نیم وا
حُسن کا میں دیکھتا تھا ارتقا

قطعہ ٦١

ہم سے نہیں یہ غولِ بیاباں سے پوچھئے
آئے کہاں سے اور کدھر جا رہے ہیں ہم
وہ کچھ نہ کہہ سکے تو خدا ہی سے پوچھئے
کس کے گناہ کی یہ سزا پا رہے ہیں ہم

قطعہ ٦٢

آپس کی بات بات پر
ہوتی ہے یہ تکرار کیوں
پھر پوچھتے ہو کس لئے
رہتے ہو تم بیزار کیوں

قطعہ ٦٣

بہت دیں تہمتیں دنیا کو گرچہ جانتا تھا میں
کہ باعث تھی شکستِ کامرانی کج روی اپنی
اگر چہ اپنی قسمت کو دیا الزام ناکامی
سمجھتا خوب تھا میں، وجہ تھی غلطی مری اپنی

قطعہ ۶۴

دستک یہ ہاتھ دیں گے اُسی در پہ، اے امیرؔ
داد و دہش کی، پیار کی، جس در سے آس ہو
چلمن کی آڑ میں کوئی بیٹھا ہو منتظر
در پردہ گر رہے بھی تو، وہ دل کے پاس ہو

قطعہ ۶۵

ریت کے ہم نے گھروندے جو بنائے تھے امیرؔ
یہ نہ سمجھے تھے کبھی موج میں بہہ جائیں گے
کھیل کھیلا تھا لڑکپن میں جو ہم دونوں نے
جانا کب تھا کہ بڑے ہوکے وہ دوہرائیں گے

قطعہ ۶۶

پھر سے دشنام، ترے لب سے سُنیں اے کافر
وہ سمٹنا، وہ تیری پردہ بدنی دیکھیں
میری گستاخ نگاہوں سے تری بے چینی
وہ تیری شعلہ بیانی وہ برہمی دیکھیں

قطعہ ٦٧

تُو ہے منصف، تُو ہے قادر، جو بھی چاہے دے سزا
ہاں مگر اتنا بتا دے، ہے سزا کس بات کی
میں نے ایسا کیا کیا جو دے رہا ہے تُو سزا
التجا کس بات کی، مانگوں دُعا کس بات کی

قطعہ ٦٨

جانتا ہوں بارِ خاطر ہوگا شکوہ آپ کو
کیا کریں، نہ روک پائے، اس دلِ شا کی کو ہم
عشق میں جائز شکایت گر نہیں ہوتی امیرؔ
کیا نہیں دیکھے سحر کو پھول کے رخسار نم

قطعہ ٦٩

'می لارڈ' کہتے ہیں منصف کو 'سر' ہر افسر کو
رہی نجات کی خواہش نہ طاقتِ پرواز
پچاس سال ہوئے ہم کو مل کے آزادی
ابھی تلک ہے غلامانہ قوم کا انداز

قطعہ ۷۰

اٹھا کے پہلا قدم دوسرا اٹھانا ہے
ہزار میل پہ مانا تیرا ٹھکانا ہے
نہ سنگِ راہ کو دیکھو، نہ خارِ پا کو امیر
اگر جو منزلِ مقصود اپنی پانا ہے

قطعہ ۷۱

اُجڑے چمن کی یاد میں روئیں کہاں تلک
اپنے وطن کو چھوڑ کے بھٹکیں کہاں تلک
اذنِ سفر دیا ہے تو، اے آسماں بتا
دشتِ جہاں میں خاک اڑائیں کہاں تلک

قطعہ ۷۲

اُس سے انکار کر نہیں پاتا
جو کہ اُمید لے کے آتا ہے
اپنی لاچارگی سے شرمندہ
مجھ سے کچھ بھی کہا نہ جاتا ہے

قطعہ ۷۳

بھوک و افلاس کے مارے ہوئے لوگوں کو امیرؔ
اور ہی رنگ میں دنیا یہ نظر آتی ہے
تو جو آسودہ ہے، یہ جان سکے گا نہ کبھی
مفلسوں کی یہاں کسطرح گزر جاتی ہے

قطعہ ۷۴

خُدا سے آدم و حوّا نے یہ سوال کیا
شبِ سیاہ کا ہونا بھی کیا ضروری تھا
ملا جواب کہ ہوتی نہیں یہ ظلمت تو
فلک پہ تاروں کا منظر بھلا نظر آتا!

قطعہ ۷۵

غلام بن کے زمانے کے تم اسیر نہ ہو
اُٹھو، اور اُٹھ کے زمانے کو خود بدل ڈالو
عمل ہو، حکمت و محنت، دعائے فضلِ خدا
جو خوف دل میں بسے ہیں انھیں مسل ڈالو

قطعہ ۷۶

التجا سننے سے پہلے ہی حضور
مجھ سے کہتے ہیں کہ حضرت اختصار
اک دفعہ جو کہہ دیا سو کہہ دیا
پوچھتے ہو کس لئے تم بار بار

قطعہ ۷۷

منکر نہیں تھا سود و ثواب نماز سے
واقف عمادِ دیں کی افادت سے خوب تھا
پر عاقبت کے واسطے کچھ بھی نہیں کیا
خدمت میں بس یتیم و لسیراں کی ہیں رہا

قطعہ ۷۸

زِیر و زَبر کا چاہیے، اعراب کا خیال
ورنہ زباں کو کہتے ہیں بولی دیہات کی
علم و ادب کا، نسل و نسب کا کلام سے
اندازہ ہو ہی جاتا ہے جس دم کہ بات کی

قطعہ

خُدا کے سامنے انسان سب برابر ہیں
گدا و شاہ میں کیوں امتیاز کرتا ہے
ہر ایک خاک سے نکلا ہے، خاک ہوئے گا
امیرؔ کس لئے دنیا میں ناز کرتا ہے
غریب کی بھی اَنا ہے، نہ دیکھ اُسکو حقیر
خدا، گناہ کی رسّی دراز کرتا ہے

قطعہ

شبنم بنے وہ گہر سے، پھولوں پہ آشکار
دریا سے مل کے ہوتا ہے طوفان بے قرار
تزئین حُسنِ برگ گُل تر جو تنہا ہے
ہوتا ہے اشتراک میں موجوں کا انتشار
دیتا سبق ہے قطرۂ ناچیز بار بار
لوگوں کے اتحاد میں ملّت کو استوار

قطعہ

سر پہ اُسکے شمسِ تاباں، ریت میں پاؤں دبے
چل رہی ہے بادِ صرصر، زندگی ہے بے شعور
پھر بھی دشتِ بیکراں میں، آتشی ماحول میں
پھل ہے دیتا کتنے شیریں، سوکھی مٹی سے کھجور
لے سبق اے مردِ ناداں اس شجر کی ذات سے
جو کہ گھبراتا نہیں ہے سختی حالات سے

قطعہ

مسجد کو ڈھا کے شان سے کہتا جہاد ہے
سازش سے تیری، قوم میں نقص و فساد ہے
ہے تیری خُو میں روحِ یزیدی چھپی ہوئی
قرآں کا حکم، پندِ نبیؐ تجھ کو یاد ہے؟
ظلم و ستم کو دے نہیں دینِ خدا کا نام
جس کو جہاد کہتا ہے، ہے قاتلانہ کام

☆☆☆

ابیات

نہیں رُکنا مری فطرت، نہیں مرکز کوئی میرا
رواں ہوں دشتِ عالم میں مکاں ہے لامکاں میرا

☆☆☆☆☆

خیالِ نو کو کرتے ہیں سخن میں ہم گُہر کیا کیا
یہی الفاظ کی بندش سے ہوتے ہیں ہنر کیا کیا

ابیات

خَم دے کے سر کو آپ نہ زُلفوں سے کھیلئے
اس دل میں تابِ حُسنِ تماشہ نہیں ہے اب

☆☆☆

ابھی تک یاد ہے وہ ملتفت نظروں کی غم خواری
بڑھے تھے چھوڑ کر جب ہم تجھے گم گشتہ راہوں میں

☆☆☆

کوئی تو کہہ دے غرورِ حُسن سے اتنا امیرؔ
ماہ بھی ہوتا ہے کامل ایک شب کے واسطے

☆☆☆

نمود و بود کو اک حادثہ ہی جانا ہے
وگرنہ خالقِ دنیا سے تھے سوال اپنے

☆☆☆

سرورِ نغمگی میں وہ نشاطِ کیف کا چھانا
خیالِ یار کا آنا خیالِ یار کا جانا

☆☆☆

یاد ہے رُخصت وہ ہونے کی ادا
وہ گلے مِل مِل کے رونے کی ادا

ہچکیاں لے لے کے ملنا باپ سے
شرم کھاتا تھا میں اپنے آپ سے

دل میں میرے اُٹھ رہے تھے وسوسے
ہاتھ میں مُرجھا نہ جائے گُل مرے

حُسن تھا، شعلہ جوانی اب نہ تھی
وہ ہنسی، وہ شادمانی اب نہ تھی

کاروانِ زندگی ٹھہرا ہے کب
ساتھ میرے تھا نہیں جو اُن کے اب

بس یہی تکلیف رہتی ہے مجھے
رنج ان کو میں نے تھے کتنے دیئے

ابیات

نہ ملی آسودگی اور نہ رہا شوریدہ حال
اک میانہ حال میں بس زندگانی کاٹ دی

☆☆☆

وقت نے کچھ اس طرح سے موڑ دی میری نظر
پہلے فردا پر تھی اب ماضی نظر آنے لگا

☆☆☆

فنا دیتی ابھی سے کیوں مجھے آواز ہے یا رب
ابھی تو لذتِ ہستی سے واقف ہو رہا ہوں میں

☆☆☆

عجیب بات ہے، جس راہ پر نکلتا ہوں
وہ راہ لوٹ کر آتی ہے تیری منزل تک

☆☆☆

خم دے کے سر کو اُس نے کیا مجھ کو جو سلام
حسرت نے اٹھ کے دل سے کہا، اب کریں گے کیا

☆☆☆

ابیات

اُس نے کہا، نہ میں نے سُنا، پھر بھی یوں لگا
خاموشیوں میں دل کی ہر اک بات کہہ گئے

☆☆☆☆

دریوزہ گرِ جلوۂ جاناں نہ بنا ہوں
تو شمع بنی، میں ترا پروانہ بنا ہوں

☆☆☆☆

یاد آگئیں جو یار کی مہماں نوازیاں
دل اشتیاقِ وصل سے بیتاب ہوگیا

☆☆☆☆

کیا چھپائے ہیں وہ پلو میں ڈوپٹے کے امیرؔ
کوئی سوغات زہے قسمتِ ناچیز نہ ہو

☆☆☆☆

ہاں کبھی آتا اُسے ہے مجھ پہ غصہ میں بھی پیار
دھوپ میں جیسے کبھی ہوتی ہے بارش کی پھوار

☆☆☆☆

ابیات

ناراض کیوں ہوئے ہیں مری بندگی سے وہ
اُنکی انا پہ کیا میرے سجدے گراں ہوئے

☆☆☆

ہاتھ کاغذ سے کٹا ہے کھولنے میں اُس کا خط
یا الٰہی! دیکھئے کیسی خبر ملنے کو ہے

☆☆☆☆

یاد جانے اُس کو کیا آیا کہ سُن کر میری بات
سر جُھکا کے مسکرایا اور پھر رونے لگا

☆☆☆

میں تھا ندائے دوست کا کچھ ایسا منتظر
دھڑکا جو دل تو سمجھا کہ آواز اُس نے دی

☆☆☆

دھندلا دھندلا مری ہستی کا دیا جلتا ہے
نہ اُجالے، نہ اندھیرے کا پتہ چلتا ہے

☆☆☆☆

ابیات

منزلیں سوئے مسافر تو نہیں آتی ہیں
ہاں مگر موت ہے جو خود ہی چلی آتی ہے

☆☆☆☆

منتظر بیٹھا ہوں میں کب سے کنار امید
تو مذبذب ہے، یہاں عالم بے تابی ہے

☆☆☆☆

ایک سوغات ہے کچھ کم نہیں تحسین کلام
اور کیا چاہیے شاعر کو تغزل کے صلے

☆☆☆☆

نہ کبھی یاد کیا اور نہ بُھلایا تجھ کو
جانے کس موڑ پہ لائی یہ محبت مجھ کو

☆☆☆☆

کیوں اُٹھاتا ہے مجھے خواب بتاں سے ناصح
چاہیے اور بھی انساں کو حقیقت کے سوا

☆☆☆☆

ابیات

کیسے گزریں خزاں رسیدہ دن
جو بہاروں کی یاد گار نہ ہو

☆☆☆☆

کہتا ہوں میں ملونگا یقیناً پھر آپ سے
جیسے کہ روز و شب پہ مجھے اختیار ہے

☆☆☆☆☆

ایک امید ہے جو آکے گزر جاتی ہے
ورنہ اس ہجر کی چوکھٹ سے نہ گزرا کوئی

☆☆☆☆☆

اتنا تو سبق، تیری صحبت سے ملا مجھ کو
کیا ذکر ہے دنیا کا، اپنے سے یقین اٹھا

☆☆☆☆☆

دو ہی باتوں سے ہے ہستی کا تسلسل باقی
ایک نابینا امید، اک ترا وعدۂ فردا

☆☆☆☆☆

ابیات

سُوکھے کانٹے بھی تو ہو جاتے ہیں سبزی مائل
اے خدا میری بہاروں میں یہ خاکی کیسی

☆☆☆☆

آئے اک بار تو، ہوتی نہ فنا کی پروا
بار ہا مرتے ہیں ہستی سے گزرنے کے لئے

☆☆☆

موت نے دی ہے وہ طاقت پرواز
اڑا جو گنجِ زمیں سے تو آسماں پہنچا

☆☆☆

کتنے ہوتے ہیں حسیں خواب سحر کے سائے
آئے سپنوں میں میری نیم حقیقت بن کے

☆☆☆☆

نیم بیدار تھا میں، نیم حقیقت وہ تھے
آج مل آیا ہوں میں خواب سحر میں اُن سے

☆☆☆

ابیات

یاد کچھ ایسے کیا دل نے تڑپ کر اُن کو
خواب میں آئے وہ تصویرِ حقیقت بن کے

ایک آزار سا آزار ہے عمرِ پیری
دردِ دل رہتا ہے عبرتِ ہستی کے سبب

بیگانگی سی اُنکی نگاہوں میں آگئی
شاید اب انکو میری ضرورت نہیں رہی

ٹمٹماتا ہے ادھر دل میں چراغِ اُمید
ہے اُدھر دُور تلک بختِ سیاہ کی ظلمت

کون سی آس ہے، دیتے ہو جو دستک اے امیرؔ
بابِ دل بند جو ہو جائے تو کھلتا ہے کہاں

ابیات

آ! اے نیندِ ابدی کہ اب نہیں باقی
طلب حیات کی، دنیا کی جستجو مجھ کو

☆☆☆

نکلا نہیں تھا صحرا نوردی کے واسطے
ہر موڑ پر میں فرطِ تجسس میں بڑھ گیا

☆☆☆

ہر طرف شور ہواؤں کا، کڑکتے بادل
بجلیاں کوندتی پھرتی ہیں گھٹاؤں میں کہیں

☆☆☆

مثلِ شمع ہوں بادِ تغیر کے بیچ میں
میں جل رہا ہوں اک آزار بے یقینی سے

☆☆☆

ہجر کی کلفت رہی نہ، وصل کی بےچینیاں
دوریاں کچھ ہوگئیں اتنی کہ واجب ہوگئیں

☆☆☆

سیدؔ جعفر امیر

ابیات

حدّتِ دَرد سے آخر نہ رہا خونِ جگر
چشمِ گریاں سے جو بہتا تھا لہو، سُوکھ گیا

☆☆☆

شُکریہ، اے چارہ گر، کیسے بتاؤں میں تجھے
جو دوا دی تُو نے مجھ کو، مرض وہ ہی بن گئی

☆☆☆

ویسے تو جانتے ہیں دُعا میں اثر نہیں
کرنے کو کر رہے ہیں دعا بار بار ہم

☆☆☆

سُکونِ دل، صحت اور شادمانی
یہی بس رہے آپ کی زندگانی

☆☆☆

فتح سے بشارت اعتماد
بار سے آزارِ بے یقینی ہو

☆☆☆

ابیات

کیا کہیں، کس سے کہیں، کیونکر کہیں
کس کو فرصت ہے یہاں غمخوار ہو

یومِ پیدائش جو آیا، وقت نے مجھ سے کہا
پھر سفینہ عمر کا چلّہ لگا کر آ گیا

تقدیر میں زوال ہے ہر ایک عروج کے
سورج کو ڈھلتے دیکھئے ہر دوپہر کے بعد

راس جبل بھی ہوتا ہے وادی کے آس پاس
دیکھا زوال ہم نے ہر ایک ارتقا کے بعد

شاید ترے وسیلے سے ہو جائے مستجاب
ویسے دعا ہماری کہاں جو قبول ہو

بے حسی اور بے رُخی کرتا رہا
صبر کی تلقین بھی کرتا رہا

گو وفا، ایثار ہی ایثار ہے
حاصلِ ہستی جہاں میں پیار ہے

ضد، کجی، غصے میں کیوں برباد ہوں
سوچ کر چلیئے تو گھر آباد ہوں

پھول اس گلشن سے چنتے جایئے
یاکہ دامن خار میں اُلجھایئے

مشکلوں پر راہ کی مت رویئے
زندگی کو اِس طرح مت کھویئے

جب کہ خفت سے کبھی دیکھا انہیں
اُن کی بھی نظریں اُٹھیں، دیکھا ہمیں

ابیات

موج جو اُٹھی سمندر میں تو ساحل کے لئے
دل میں اٹھی ہر تمنا اس طرح تیرے لئے

☆☆☆☆

رواں ہوں بادِ باراں کی طرح میں دشت و گلشن میں
نہیں رکنا مری فطرت، گزرنا کام ہے میرا

☆☆☆☆

ویسے تو بدلتی ہے ہر چیز زمانے کی
اک فطرتِ انساں ہے جو کم ہی بدلتی ہے

☆☆☆☆

بزم طرب میں رہ کے بھی دیکھا بہت امیرؔ
دردِ جگر جو اس نے دیا ہو سکا نہ کم

☆☆☆☆

مصروف روزگار ہیں، فکریں ہزار ہیں
اس جانِ ناتواں پہ میری کتنے بار ہیں

☆☆☆☆☆

ابیات

مل جائے گر سخنور، پیغام اُس کو دینا
اس بے وطن سے باتیں دو چار کر کے جائے

نیند آ جائے گی آخر کو تھکی آنکھوں میں
دل کو بہلاتے ہیں ہر رات سحر ہونے تک

ذوقِ نظر کو دیکھئے، کس کو لیا پسند!
وہ پھول جو کہ میری پہنچ سے بہت تھا دور

ہر تلخیِ حیات کو دل سے بھلا دیا
آزارِ دل جو تھا اسے میں نہ مٹا سکا

بربط ہے، مے ہے، مہ ہے، حسیں کتنی رین ہے
لیکن کسی نہ پہلو مرے دل کو چین ہے

سیّد جعفر امیر

ابیات

سوا میعاد کے خود اپنی کوئی جا نہیں سکتا
فلک کی سُو اُڑے ذرہ، فلک کو پا نہیں سکتا

☆☆☆

نُطق بے جان ہوا، طاقتِ گفتار گئی
جو فنا آئی تو یہ وقت کی تکرار گئی

☆☆☆

اُلفت کو میری ایسے نہ افسانہ کیجئے
کیجئے اگر، تو ایسے نہ بیگانہ کیجئے

☆☆☆

پیشِ عقرب کے کوئی دوست، کوئی غیر نہیں
نیش زن باعث افتاد ہے، کچھ بیر نہیں

ذلتیں عمرِ اسیری کی جو سہہ لیں میں نے
"موت نے آ کے کہا جا تجھے آزاد کیا"

ابیات

بات کرتے ہیں تو حُجت گفتگو ہو جائے ہے
بات کرنے کا مزا کیا اس طرح سے آئے ہے

ضیاءِ شمس سے ہے ارتعاش ذروں کا
اُسی سے نیل ہے، در پردہ اک سیاہی ہے

عمرِ پیری میں ہے گہری نیند کا آنا محال
جس طرح سے سردیوں میں برگ سے عاری ہو ڈال

شبِ حیات کی محرومیوں پہ کیا روتا
وہ چارہ گر مرا ہوتا، اگر خدا ہوتا

خیالِ نو کو کرتے ہیں سخن میں ہم کہہ لیا کیا
یہی الفاظ کی بندش سے ہوتے ہیں ہنر لیا کیا

سیّد جعفر امیرؔ

ابیات

سوادِ منزلِ ہستی نظر آنے لگی آخر
غبارِ کاروانِ وقت جو آگے بڑھا مجھ سے

☆☆☆☆

ناصح یہ ہنس کے کہنے لگا سُن کے میرا حال
ہم کہہ رہے تھے پیار کا سودا کریں نہ آپ

☆☆☆☆

منہ موڑ کے وہ جاتے ہوئے مجھ سے کہہ گئے
سُنتے ہیں یہ ہی آخری منزل ہے عشق کی

☆☆☆☆

وابستہ ہوگیا تھا جو میں ترے نام سے
ہر بُت نے اپنا خیر سے دامن بچا لیا

☆☆☆☆

آداب میں تو کہہ نہ سکا، نیند آئی ہے
حُسنِ طلب میں لیتا وہ جھوٹی جمائی ہے

☆☆☆☆

ابیات

ہموار ہو زمیں تو سڑک سیدھی جائے گی
دشت و جبل میں راہ مگر پیچ کھائے گی

جو چمن دہکا ہوا ہے آتشِ گل نار سے
اُس چمن میں کیوں خزاں کا رنگ بھرتے ہو امیر

کشتی بھی بنا لی، لنگر بھی، کچھ زادِ سفر بھی ساتھ لیا
پر، جوشِ سفر میں بھول گئے طوفاں بھی کھڑے ہیں راہوں میں

چھیڑو نہ ہمیں، طوفانِ الم سینے میں امنڈتے رہتے ہیں
ایسا نہ ہو، اس اُلجھن میں، ہم پھونک ہی ڈالیں کاشانہ

کر دے آزاد مجھے گردشِ دوراں سے خدا
نقش رنگیں ہیں جنھیں ضبط قلم کرنا ہے

ابیات

زندگی ہے دھوپ چھاؤں کی بدلتی صورتیں
جب ملی ہم کو خوشی، محرومیاں بھی ساتھ تھیں

☆☆☆

حُسن اندازِ بے نیازی ہے
عشق پیغامِ دل گدازی ہے

☆☆☆

رسمِ سلام و بندگی اب رہ گئی فقط
ملنے کی گفتگو ہے نہ پیغامِ شوق ہے

☆☆☆

اُکھڑے اُکھڑے سے بڑے دُور سے کرتے ہیں سلام
مسکراہٹ ہے، نہ عشوہ، نہ غصہ، نہ کلام

☆☆☆

پڑیں گے آبلے راہِ وفا پہ چلنے سے
ملا چراغ کو کیا رات بھر کے جلنے سے

☆☆☆

ابیات

آنسوؤں کا ڈھل کے رُک جانا وہ پلکوں پر ترے
شدّتِ جذبات کی شعلہ بیانی یاد ہے

☆☆☆

اگر نہ عشق کی منزل سے آدمی گزرے
تو زندگی کی حقیقت کو کس طرح سمجھے

☆☆☆

ادائے حُسن کا دیوانہ گو ہمیشہ رہا
مزاجِ حُسن کو سمجھا نہ یہ زمانہ کبھی

☆☆☆

کوئی نوائے دلبر ہم تک کبھی نہ آئی
کہتے ہیں دشمنی کو کیوں دوست خیر خواہی

☆☆☆

دل ہے بے چین، ادھر شام سے آنکھیں بھی ہیں نم
پھر مرے سامنے رکھ دو مرے قرطاس و قلم

☆☆☆

ابیات

سرسراہٹ جب ہوا کی شب کی خاموشی میں ہو
اُس کے لہراتے ہوئے آنچل کا آتا ہے خیال

☆☆☆

عزّتِ سادات کھوئی، ہوگئے دریوزہ گر
''مردِ ناداں پر کلامِ نرم و نازک بے اثر''
(اقبالؔ)

☆☆☆

کیسے میں اپنے پیار کا قصہ بیاں کروں
ہے جو کسی کا راز وہ کیسے عیاں کروں

☆☆☆

لا اگر سکتا زباں پہ تو یہی کہتا ندیم
میرے دل کو بھی جلاتا ہے ترا دردِ نہاں

☆☆☆

جس کا آغاز ہو آوازِ شکستِ دل سے
ایسے افسانے کو شرمندۂ انجام نہ کر

☆☆☆

ابیات

جنم دن ہو مبارک، دوست میرے آ کے کہتے ہیں
انھیں معلوم کیا ہم مدتوں سے کیسے رہتے ہیں

☆☆☆☆

یہی اشجار، یہی نیلا فلک، بہتی ندی
جانے کیوں یاد تری پھر سے دلا دیتے ہیں

☆☆☆☆

نظریں جھکا کے شرم سے دیکھیں ہمیں نہ آپ
ڈر لگ رہا ہے ہم کو بہت اپنے آپ سے

☆☆☆☆

جانا کدھر تھا، کون سی منزل نظر میں تھی!
اچھا ہوا کہ چھُوٹ گئے کارواں سے ہم

☆☆☆☆

آ بھی جاتے ہیں کنارے موج میں بہتے ہوئے
چھوڑ دی کشتی خدا پر بیچ میں منجدھار کے

☆☆☆☆

مسکراہٹ چہرے پر روشن ہوئی
پیار کی تصویر جیسے بن گئی

میری آنکھوں میں ندامت کا اثر
دیکھ کر کردی خطائیں در گذر

دل کی یہ باتیں سنائیں کس کو ہم
نکتہ چیں ہوتے ہیں، نکتہ داں ہیں کم

پیار کو مضمون آفاقی کیا
لفظ بے معنی تھا بامعنی کیا

ابیات

نغمگی ہوتی ہے حسّاس سماعت کے لئے
بے اثر میری غزل آپکی محفل میں ہوئی

☆☆☆

دل کی دنیا ٹوٹ رہی تھی، ذرہ ذرہ بکھر رہا تھا
کشتی میری ڈوب رہی تھی، دل میں طوفاں ابھر رہا تھا

☆☆☆

قصے سنا رہے ہیں وہ تیزی سے، اور پھر
اوروں سے پوچھتے ہیں کہ، کیا کہہ رہے تھے وہ

☆☆☆

آجا کہ مجھ کو کب سے تیرا انتظار ہے
تو ہی بساطِ عیش ہے، تو ہی بہار ہے

☆☆☆

یادِ خُدا میں دوست مرے ایسے کھوگئے
کہتے ہیں اب نہیں بخدا دوستی کا وقت

☆☆☆

ابیات

محبت ایسی حالت ہے نظر آتی نہیں جس میں
کہیں کمزوریاں محبوب کامل میں زسرتا پا

نہ تو انکار کی صورت ہے نہ اقرار کی ہے
میری حالت تو فقط بندۂ ناچار کی ہے

فائدہ یہ تو غم دورِ محبت سے ہوا
یاد ایسی نہیں جو ہم کو ستائے آ کر

رہِ حیات میں اک ہمسفر کا ملنا بھی
جو ہم نوا بھی ہو، اک اتفاق ہوتا ہے

ملنے کا مجھ سے آپ کو کتنا ہے اشتیاق
کہتے ہیں آپ 'آئیے' جب بھی کبھی ملے

سیّد جعفر امیر

ابیات

شعر ہو سکتا نہیں، جب تک نہیں ہوتا سُرور
موجِ طوفاں کے لئے ہے باد کا ہونا ضرور

☆☆☆

نہیں تھی گرچہ خواہش کچھ مجھے داد و ستائش کی
مگر اچھا لگا ہے آپکا یہ آفریں کہنا

☆☆☆

آ گیا ہے اب عناصر میں کچھ ایسا انحطاط
ہوگیا مشکل بہت ہے زندگی سے ارتباط

☆☆☆

حال کچھ اپنا سُناتے، مگر اک مُدّت سے
روز و شب کیسے گزرتے ہیں یہ معلوم نہیں

☆☆☆

شعلۂ نُور سے شبنم کی حقیقت زائل
نہ رہا میں بھی تری برق نظر کا مارا

☆☆☆

ابیات

حیف ہے، گمنام کتنے ہو گئے تاباں ہنر
ہو کے بھی، جو ہو نہ پائے، قوم کا گنجِ بہا

☆☆☆

ثبوتِ حق میں ہے پھولوں کی جلوہ آرائی
سحر کو، بُلبُلِ گُلشن کی یہ صدا آئی

☆☆☆

دوست کہتے ہو جسے، کل وہ ہو دشمن شاید
رازِ دل کے نہ کبھی اپنے زمانے کو بتا

☆☆☆

گھر کی تنہائی میں کس کا ہے تصور تجھ کو
یاد کرتا ہے جسے اب نہ کبھی آئے گا

☆☆☆

نہ سہی وہ، نہ سہی، بادِ سحر ہی آئے
دو گھڑی ہی کے لیے، کوئی ادھر بھی آئے

☆☆☆

ابیات

اور ہو تم، وہ نہیں ہو جو کبھی سمجھا تھا میں
جان تم کو نہ سکا اپنے حوالے سے کبھی

☆☆☆☆

دھانس کی تحریک سے ہے بھوک میں اب اشتعال
ہائے اُس کافر پڑوسن نے بگھاری پھر سے دال

☆☆☆☆

برستے کیوں نہیں بادل جو دل پہ چھائے ہیں
اے آنکھ، بہہ کہ رگِ جاں سے آنسو آئے ہیں

☆☆☆☆

نہ رہے جذبہ و احساس مرے پہلے سے
آخری عمر میں بس رہ گئی کلفت باقی

☆☆☆☆

شعلوں میں نار کے ہے کہاں اسقدر تپش
تلبیس کو جو تیری جلا کر کرے وہ خاک

☆☆☆☆

ابیات

سفر ہو کتنا ہی لمبا، مسافتیں بے حد
قدم اٹھا کے قدم تجھکو آگے بڑھنا ہے

☆☆☆

ہوش مندی یہ کہے، دیکھ حقیقت کو امیرؔ
دلِ نادان کہے، کیوں نہ ہوں خوابوں کا اسیر

☆☆☆

علم و تحقیق و تلاش و نظر و فکر و تمل
یہ رہیں زادِ سفرِ حق کے مسافر کے لئے

☆☆☆

او، دل دُکھانے والے تو نے کبھی یہ سوچا
اوروں کا دل دھڑکتا تیری طرح سے ہوگا

☆☆☆

رقص کرتا ہوا جب شعر قلم سے اترا
میں یہ سمجھا کہ مجھے دولت کونین ملی

☆☆☆

سیّد جعفر امیرؔ

ابیات

ہمیں بھی آتا ہے اندازِ گفتنی صاحب
خموش بیٹھے فقط آپ کے لحاظ میں ہیں

☆☆☆

سکون دے میرے یارب کہ زندگی کا سفر
گزر کے ایک قیامت سے موت تک آیا

☆☆☆

اگر جو کہنے پہ آتے تو ایک دفتر تھا
خموش بیٹھے رہے آپ کے لحاظ میں ہم

☆☆☆

ہچکی جو آئی، مری تسلی کے واسطے
کہتا ھے کوئی یاد کسی نے کیا مجھے

☆☆☆

تھک جو گیا تحفظِ ساحل سے میں امیرؔ
اُٹھا، اور اٹھ کے شورشِ طوفاں کو جالیا

☆☆☆

ابیات

نعمت ہر ایک مجھ کو میسّر ہوئی مگر
بچپن کی بھوک ہے نہ زباں کا مزا رہا

نعمت ہر ایک مجھکو میسّر ہوئی مگر
لائیں کہاں سے عہد جوانی کی اشتہا

آیا وہ دور جب کہ میسّر ہیں نعمتیں
لیکن وہ چاشنی ہے نہ اب لذّت زباں

ہنس کر مرے سوال پہ کہنے لگے امیرؔ
سینئے، لسانِ حُسن میں ہوتی نہیں زباں

بھٹک کر، یہ بھی ہوتا ہے، پہنچ جاتے ہیں منزل تک
اُسی اُمید میں پھرتے رہے ہم بے سر و ساماں

سیّد جعفر امیرؔ

ابیات

فاصلہ منزلِ مقصد کا ہو کتنا ہی طویل
ابتدا اُس کی طرف پہلے قدم سے ہو شروع

☆☆☆☆

تجھ سے ملے ہوئے مجھے گو مدتیں ہوئیں
تیرے خلوص و پیار کو بھولا نہیں ہوں میں

☆☆☆☆

آپ کو شوقِ نظارۂ عالم ہے اُدھر
شوقِ دید ہے تیرا حُسن مجھ کو اِدھر

☆☆☆☆

تابِ ہستی کی، صعوبت کی، نہ کچھ ہوتی امیرؔ
جو نہ فردا کی حقیقت کا تجسُّس ہوتا

☆☆☆☆

دھندلے دھندلے سے نقوش بھولی کھوئی سی صدا
رہ گئی اس سے محبت کی نشانی باقی

☆☆☆☆

ابیات

میری آنکھیں جو کبھی واقفِ گریاں نہ ہوئیں
اشک رُکتے ہی نہیں ان سے ترے جانے پر

نہ ٹھکانا ہے کوئی اور نہ پتہ ہے اپنا
لامکاں ہی ہے مکاں، ہم سے فقیروں کے لئے

سفر ہمارا ہے پابند 'اصل' کی جانب
تو پھر بھٹکتے ہیں ہم کیوں فریبِ ہستی میں

تیرے آنے پہ بہاتا ہوں خوشی کے آنسو
تیرے جانے پہ ہوئیں درد سے گریاں آنکھیں

ہم کو تب شکوہ کوئی جانِ تمنا ہوتا
تیرا ہر وعدہ اگر وعدۂ فردا ہوتا

حرفِ تشکر

میں فدا حُسین صاحب اور اُنکے اعزاء کا بے حد ممنوں ہوں جنھوں نے میرے کشمیر کے قیام میں مہمان نوازی کی حد نہ رکھی اور ہر نوع سے میرے مجموعے کلام 'بہ رنگِ دگر' کی تشکیل اور کتابت میں میری ہمت افزائی اور مدد کی۔

ڈاچھی گام کی بستی کے قریب، مہادیو پہاڑ کی بلند چوٹی کے دامن میں، ندی کے کنارے، کاشتگاہوں اور باغات سے متصل ،۲۰۰۹ء کا موسم گرما میری زندگی کا ایک بہت خوبصورت تجربہ تھا۔ کچی سڑکوں پر شام میں ٹہلتے ہوئے میں حُسن قدرت کی انتہا سے ہمکنار، ایسے جذبات سے سرشار ہو جاتا جن کو بیان کرنا مشکل ہے۔ باوجود اسکے کہ میرا زیادہ تر کلام حُسن قدرت کی سربائی کا آئینہ دار ہے، میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ زندگی کے اس تنہا سفر میں یہ قدرتی مناظر ہی تھے جو میرے دل کے سکون کا باعث بنے۔ قدرت کا پوری طرح شکریہ شاید ادا نہ کر سکوں گا، نہ ہی فدا حُسین صاحب کا جن کے حُسنِ اخلاق، خلوص اور محبت کی وجہ یہ مقام اور ماحول مجھے میسر ہوئے۔

میں سلطانہ مہر صاحبہ (انگلستان) کا بھی بہت ممنوں ہوں جنھوں نے مجھے ڈانٹیں پلا پلا کر اشاعتِ کلام پر راغب کیا اور اس ادبی سفر میں میری ہمت باندھتی رہیں۔ میں محسن عرفی صاحب کا، جو حیدر آباد کے ایک نامور شاعر ہیں، بھی ممنون ہوں جنھوں نے میرے اس کتاب کے مسودے کی پروف ریڈنگ کر کے نگارش کو آراستہ کیا۔

سید جعفر امیر ۲۰ ستمبر ۲۰۰۹ء

بنجارہ پہاڑ

جس جگہ جانِ جہاں تجھ سے ملا تھا پہلے
دل نے یہ مجھ سے کہا آ! کہ وہاں چلتے ہیں
مدّتیں بیت گئیں چل کے ذرا دیکھیں گے
آم کی ڈال پہ کیا پھول کھلا کرتے ہیں

صندلی دھوپ سے بھیگی ہے وہ مدہوش ہوا
وہ ہی منڈوا ہے چنبیلی کا جہاں بیٹھے تھے
بادِ مخمور کے شانوں پہ لچکتی شاخیں
اب بھی رقصاں ہیں منڈیروں پہ جہاں بیٹھے تھے

دل کے اصرار پہ میں نے وہاں جا کر دیکھا
سرنگوں ہے وہی خاموش سا وہ آم کا جھاڑ
بیلیں پھولوں کی ہواؤں میں لچکتی تھیں ہنوز
دور تک تھا وہی منظر، وہی بنجارہ پہاڑ

ابیات

جادۂ عشق کے نشاں دیکھو
چشمِ حسرت کی تم زباں دیکھو

☆☆☆☆

شعر ہو سکتا نہیں، جب تک نہیں ہوتا سرور
جیسے بادِ تند سے ہو موجِ طوفاں کا ظہور

☆☆☆☆

منظرِ حُسن اگرچہ عام نہیں
یاں تصوّر بھی تشنہ کام نہیں

☆☆☆☆

غیر کا کرتے بھلا کس منہ سے شکوہ اے امیرؔ
خود ہی اپنے آپ سے رہتے ہیں جب اُلجھے ہوئے

☆☆☆☆

ڈبو کے نوکِ قلم آنسوؤں کی سرخی سے
حیاتِ درد کی اک داستاں رقم کی ہے

☆☆☆☆☆

ابیات

مرکز ہیں دائرے کا وہ، اور میں ہوں دائرہ
گردش میں اس کی یعنی کہ رہتا دوام ہوں

دل کی تڑپ اشعار کا مضمون بن گئی
ورنہ غزل کا شوق مجھے کیا ضرور تھا

شور کیسا ہورہا ہے، ہے یہ ہلچل کس لئے
پھر سے گزرا ہے یہاں سے کیا امیرؔ کا شباب

چھوڑ جاتے ہیں حوادث دل پہ جو اپنے نقوش
داستانِ زندگی میں وہ ہی ہوتے ہیں رقم

راہِ حیات سے کوئی گزرا نہ بار بار
کر لو مزے کہ کل کا نہیں کوئی اعتبار

ابیات

دوستی آپکی جیسے کہ ہو کچا دھاگا
بار اک رنجشِ ناداں کا ہوا اس کو گراں

☆☆☆

وہ کہتے ہیں باتوں میں 'یعنی' و 'معنی'
کوئی بات شاید وہ سمجھا رہے ہیں

☆☆☆

مشورہ دینا عبث ہے پند نہ کریو امیرؔ
رائے گاں ہوتی ہے رائے جب طلب اُسکی نہ ہو

☆☆☆

جائزہ جب کسی کا تم کرنا
اس کے حالات کو سمجھ لینا

☆☆☆

زندگی کے سارے رشتے توڑ کر جاتے ہیں ہم
اس جہاں کو، اللہ بیلی، چھوڑ کر جاتے ہیں ہم

☆☆☆

ابیات

کوئی تجویزِ عمل ہو، کوئی منزل کا سراغ
منتشر دشت میں پھرتا ہے قافلہ میرا

☆☆☆☆☆

فنا سے ڈر نہیں مجھ کو، یہ خوف لاحق ہے
اجل کی راہ میں، پیری کی منزلیں ہونگی

☆☆☆☆☆

لیں گے تجھ سے بھی نپٹ، اے گردشِ دوراں کہ ابھی
ہوگئی ہے میری اس وقت فلک سے حجت

☆☆☆☆☆

تابندہ تھی وہ تا بہ سحر ایک رات کی
دیکھو شمع کو، سمجھو حقیقت حیات کی

☆☆☆☆☆

شکریہ اے چارہ گر، کیسے بتاؤں میں تجھے
جو دوا دی تُو نے مجھ کو، مرض وہ ہی بن گئی

☆☆☆☆☆

ابیات

گرچہ نہیں ہے قطرے کی اپنی کوئی بساط
قطروں کے اشتراک سے بنتا ہے زورِ موج

☆☆☆

جب نہیں منزل مقرر، راستہ گم نام ہے
اے مسافر کس لیے کرتا ہے تجدیدِ سفر

☆☆☆

نہ توڑ شیشۂ دل کو مرے تو اے ساقی
یہی وہ شیشہ ہے جس میں گلابِ ہستی ھے

☆☆☆

وقتِ رخصت

دل کی دنیا ٹوٹ رہی تھی، ذرہ ذرہ بکھر رہا تھا
کشتی جیسے ڈوب رہی تھی، طوفاں جیسے سنور رہا تھا

☆☆☆

سیکھ شاخوں سے لچک، شکوۂ طوفاں بیجا
لوچ طبیعت میں ضروری ہے بقا کی خاطر

☆☆☆

ابیات

مدِّ راہ سنگ نہیں رودِ رواں کے آگے
آب جھرنوں سے نکلتا ہے تو بہنے کے لئے

☆☆☆☆

بادِ طوفان، نظر کیوں ہے مری کشتی پر
کیا فلک اور نہیں تیرے بپھرنے کے لئے

☆☆☆☆

اُوج دو اتنا تدبُّر و عمل کو اپنے
پوچھے قسمت کا ستارہ کہ کدھر جاؤ گے؟

☆☆☆☆

آفتیں چین سے رہنے نہیں دیتیں دن میں
شب بھی آتی ہے مری خواب پریشاں لے کر

☆☆☆☆

بے حسی بھی کبھی ہوتی ہے مسائل کا حل
ہو کے حسّاس بھلا نیند اڑاتے کیوں ہو

☆☆☆☆

ابیات

اپنی پرواز کو محدود نہ کر
حد بتا دے گی طاقتِ پرواز

☆☆☆

آسودگی کا اپنی بیاں کم ہی کر امیرؔ
بختِ سیہ کو راس نہ آئے تری خوشی

☆☆☆

واجب اور فرائض کی ہو پہلے تکمیل
پھر حقوق کے اپنے، بیاں کرو تفصیل

☆☆☆

نہ کہہ حُسینؑ کو باغی کہ اُن کے نانا پر
سوال ہوگا، نواسوں کو درس دے نہ سکے

☆☆☆

بہت حسین ہے دنیا اگر ہے ذوقِ نظر
سحر کو، گھاس کی پتی پہ رقصِ شبنم دیکھ

☆☆☆

ابیات

بُھولو نہیں کہ عشق و محبت کے کھیل میں
ایثار تم کو کرنا پڑے گا ہزار بار

یہ ضروری نہیں کہ سچ بھی ہو
جو کہ مشہور ہے زمانے میں

راز اپنے بتا نہ تو سب کو
آج کا یار کل کا دشمن ہو

تحریر کے تو معنی نہ لفظوں میں کر تلاش
کاتب کی بات رہتی ہے جملوں کے درمیاں

اثر ہو بات کا جب ہو ادائیگی اچھی
شکستہ ساز سے اُٹھتے نہیں حسین نغمے

سید جعفر امیر

ابیات

رکھو تم اپنے آپ پہ قابو کہ اے امیرؔ
سُلجھا ہوا دماغ ہی ہے اُلجھنوں کا حل

☆☆☆

ہیں کلی کی پتیاں جو شرم سے سمٹی ہوئی
کس طرح خم کھا کے کھلتی ہیں سحر کی اوس سے

☆☆☆

نام لکھنا چاہتا تھا اپنا لیکن اے امیرؔ
چھیڑ میں میری قلم نے لکھ دیا کافر کا نام

☆☆☆

وقتِ رخصت، فرطِ غم سے دل بہت جاتا ہے ڈوب
سرخ ہو جاتا ہے چہرہ شمس کا وقتِ غروب

☆☆☆

بیٹھے بیٹھے ہی اُمنڈ آتے ہیں آنسو یارو
یاد کس کی ہمیں آ آ کے رُلا دیتی ہے

☆☆☆

ابیات

منزلیں اُنکی الگ ہیں، راہ اپنی ہے الگ
چل رہے ہو ساتھ اُنکے پا بہ جولاں کیوں امیرؔ

☆☆☆☆

چھوڑ جاتے ہیں حوادث دل پہ جو اپنے نقوش
داستانِ زندگی میں وہ ہی کرتا ہوں رقم

☆☆☆☆

شب کو سونے میں جو اک نقش ابھر آتا ہے
میرے گم گشتہ خیالات کا اک سایا ہے

☆☆☆

ہاتھ، اُنگشتِ نبیؐ تھام کے جو چلتے تھے
کفر کے ہاتھ پہ بیعت وہ ہاتھ کیا کرتے

☆☆☆☆☆

جانے جلنے کی تھی حسرت کہ تصادم کا جنوں
برق گرتی ہے جہاں، اسکو مکاں کرتے ہیں

☆☆☆☆

یہی تھا میرا حرم، میرا صنم خانہ بھی
اسی کعبہ میں کسی بُت کی عبادت کی تھی
حسنِ مغرور نے توڑا تھا خدائی کا بھرم
ایک انسان نے انساں سے محبت کی تھی

تھا یہی کنج جہاں اُس سے ملا کرتا تھا
اُس کی زلفوں میں یہیں پھول لگائے میں نے
اپنی گستاخ نگاہوں کی شکایت تھی سنی
کتنے روشن تھے دیے جو کہ جلائے میں نے

خوفِ دنیا جو اسے تھا، تو پریشاں تھا وہ
وہ یہ کہتا کہ بہت دیر ہوئی، چلتے ہیں
میں یہ کہتا کہ ذرا دل کی میں باتیں کہہ لوں
لاکھوں ارمان چراغوں کی طرح جلتے ہیں

ابیات

اتنا نہ تشنہ کام مجھے آپ چھوڑیۓ
کچھ تو جواب میرے سوالوں کا دیجیۓ

☆☆☆

جو دیکھی سحرِ بہاراں تو مجھکو یاد آئی
ترے شباب کی کروٹ، ترا خروشِ جمال

☆☆☆

لڑکھڑانے لگی ہے لوِ حیات
اک بہانے کی منتظر ہے ممات

☆☆☆

پردہ کو شکوۂ دیرینہ پہ رہنے دو امیرؔ
پردہ اُٹھنے پہ وہ اک باعثِ رنجش ہوگا

☆☆☆

کیسا انصاف ہے اے منصفِ اعلیٰ تُو بتا
جو ہیں بدکار انہیں پر ہے تری چشمِ کرم

☆☆☆

ابیات

دِل یہ چاہتا ہے کہ اب تو لیٹ کے سو جائیں ہم
کب تلک یہ کشمکش، یہ ہوش بیہوشی رہے

کہتے ہیں وہ کہ آپ تو ملتے نہیں کبھی
کہتا ہوں میں کہ آپ بلا کر تو دیکھئے

ہو چلی ہے نبض ہستی اسطرح سے سست گام
جیسے بڑھتا دھندلکا ہے شب میں ڈھلنے کے لئے

گِل چاہ، صرف چاہ نہ ہوئی
خاک اپنی وطن رسا نہ ہوئی

جس ارتقاء جوش کو کہتے جنون ہیں
حدت سے اسکی شعلہ جوالہ فنون ہیں

ابیات

نوٹ:۔ اتوار کا دن تھا، دوپہر کا وقت۔ تنہائی میں سوچا کچھ موسیقی سُن لوں۔ ایک پرانے گانوں کا ٹیپ لگایا۔ ٹیپ میں کئی گانے ایسے تھے جن سے پرانی یادیں وابستہ تھیں۔ آنکھیں بے اختیار بہنے لگیں۔ اس حالتِ اندوہ میں یہ شعر ہوئے۔

جو بھری برسات میں نغمے سنا کرتے تھے ہم
سُن کے انکو آج پھر آنسو مرے بہنے لگے

☆☆☆

جانے کیوں آج یہ رُکتے نہیں آنسو میرے
یاد کس کی ہے جو یوں آ کے رُلاتی ہے مجھے

☆☆☆

سینے میں جلن سی ہوتی ہے، آنکھوں میں دھنواں سا اُٹھتا ہے
سنتا ہوں کبھی جب میرے صنم، وہ گیت جو تُو نے گائے تھے

☆☆☆

ابیات

بھلا یہ لوگ پہلو میں کھڑے کیوں میرے روتے ہیں
پریشاں رات ہے کاٹی، سحر ہوتی ہے، سوتے ہیں

☆☆☆☆

گھبرا رہا تھا دل تری محفل کو چھوڑتے
لیکن سکوں سا آگیا تنہائیوں کے بیچ

☆☆☆☆

اُن کی شکایتوں کی حقیقت نہ جان لیں
چُپ اس لئے ہم ہوگئے رُسوائیوں کے بیچ

☆☆☆☆

کیوں زمانے بھر میں تم رُسوا ہمیں کرتے پھرے
میری رسوائی کہیں تم کو بھی رُسوا کر نہ دے

☆☆☆☆

ہاں بہت بھٹکے جہاں میں، بے سروساماں رہے
کیا سفر کا لطف ہمدم، ٹھوکریں کھانے میں ہے!

☆☆☆☆

ابیات

ہر ایک سے میرا ذکر نہ اس طرح کیجئے
رُسوا کہیں نہ آپ بھی ہو جائیں میرے ساتھ

تھک گئے کتنے عاقلانِ جہاں
مقصدِ زندگی نہیں پایا

ہوگئی رات آدھی واعظ کا بیاں سُنتے ہوئے
مہ وشوں میں چل کے باقی رات اپنی کاٹ دے

غم ہائے روزگار سے فرصت اگر ملے
اپنی زباں پہ لاؤں گا میں درد دل کی بات

آؤ! اے اہل سخن آغاز سخن کرتے ہیں
بے وطن سب ہیں یہاں، یادِ وطن کرتے ہیں

ابیات

کبھی تو اشک، کبھی آہ ! شعر بن جائے
مگر یہ شعر میرے وہ نہ کچھ سمجھ پائے

☆☆☆

پھر نہ کریں گلہ کہ نہیں دوستی کا پاس
دیکھیں کہ کس کی دید کو آیا ہوں اتنی دور

☆☆☆

اثر اُس بات کا ہوگا نہیں زمانے پر
وہ بات نرمیٔ گفتار سے جو عاری ہو

☆☆☆

دور ہو، خاموش ہو، کیوں مجھ سے تم ناراض ہو
چند بہاریں دیکھ لو یاں چل کے میرے ساتھ ساتھ

☆☆☆

رہبر کوئی، نہ راہ ہے، کوئی نہ پاسباں
آدم کا اس جہاں میں پھرتا ہے کارواں

☆☆☆

ابیات

خلوص جو ہو نہیں وہ بات بے اثر ہوگی
جو دل سے نکلے وہی بات معتبر ہوگی

☆☆☆

اک بھول تھی نادانستہ جو مجھ سے ہوگئی
ترکِ ادب میں آپ سے کرتا! مجال تھی

☆☆☆

گرفتِ نکتہ چیں کیا بات تھی کہ کل مجھ سے
ملا وہ جیسے کوئی رسمِ دوستی ہی نہ تھی

☆☆☆

مسائل کچھ نہیں، اُفتاد ہے اپنی طبیعت کی
جو ہم ہر واقعہ کو داستانِ دردِ جاں سمجھے

☆☆☆

سدِّ رہ تھے، زندگی کی راہ میں میرے ہی یار
پھول جن کو میں نے سمجھا، تھے وہی پاؤں کے خار

ابیات

بدلتی رہتی ہے تہذیب ہر زمانے میں
جو آج طرزِ ادب ہے وہ کل نہیں ہوگا

☆☆☆☆☆

بُغض و حسد کے دل سے تو پردے اُتار دے
معیوب ہے ادب میں سخنور سے دشمنی

☆☆☆☆☆

میں یہ سوال پوچھ نہ پایا رفیق سے
کیوں اس طرح سے پیکر تذلیل ہو گیا

☆☆☆☆☆

مردِ معقول ہوا اور نہ دنیا شامل
میں نہ ہونا تھا ہوا تیری نظر میں کامل

☆☆☆☆☆

آمدِ صبح سے بے نُور ہوئی جاتی ہے
شمع اب جلنے سے معذور ہوئی جاتی ہے

☆☆☆

ابیات

جی نہیں لگتا میرا اب بستیوں کے درمیاں
کچھ سکوں مل جائے شاید دشت کی تنہائی میں

☆☆☆☆

کیسے اس پر یقیں ہمیں آئے
پیار کا جس کے اعتبار نہ ہو

☆☆☆☆

ہے ترقی کے لئے علم کا ہونا لازم
علم کیا ہے کوئی اُسکا تعیّن بھی کرے

☆☆☆☆

پہلے رہتے تھے بہت طرّہ و دستار کے ساتھ
اب نہیں ہم کو رہا چاکِ گریباں کا خیال

☆☆☆☆

یوں جو ہوتا تو ہوتا ایسے، پر
بات ٹوٹی ہے جا کے پیسے پر

☆☆☆☆

ابیات

سمجھ میں ایک زمانے کے بعد یہ آیا
کیا قریب جسے اُس کو ہی نہیں پایا

مرحبا، تُو جو ہوا حافظِ قرآں اے شیخ
ہم نے بھی نقش کیئے حرفِ الٰہی دل پر

اور ہو جائے گا مغرور وہ ظالم، حضرت
میں نے کھینچی ہے جو تصویر، بتائیں نہ اُسے

گو جانتے تھے حُسن کی ہرجائیاں مگر
دھوکے میں فتنہ ساز کے ہم پھر بھی آ گئے

میرے ہونٹوں پر ہنسی دیکھی تو جل کر یہ کہا
ہو گیا ہے زہر کا کیا آپ پر کچھ کم اثر

اُس کے رُخسار پہ تاباں تھی سحر کی لالی
زُلفِ پیچاں کو بکھرنا تھا، بکھر جاتی تھی
ٹھنڈے ہاتھوں میں پسینہ کبھی آجاتا تھا
ہر ادا اُس کی مرے دل میں اُتر جاتی تھی

جانے کب تک میں چلا راہ پہ یوں محوِ خیال
گہرِ ماضی سے جھلکتی رہیں یادیں کیا کیا
جیسے مدھم سی کناروں پہ چراغوں کی ضیا
میری حسرت میں چھپی اسکی مرادیں کیا کیا

آہ! جس راہ پہ ہم دونوں چلا کرتے تھے
وہ ہی کوہسار ہیں، وادی کی وہی گہرائی
ایک حالات کا بدلہ ہوا بس میں ہی ہوں
دورِ ماضی کی کسی یاد کا اک سودائی

جس جگہ جانِ جہاں تجھ سے ملا تھا پہلے

ابیات

آبِ انگور بھی، حُوریں بھی، سُنا ہے ہونگیں
ترکِ لذات کیا وعدۂ فردا پہ امیر

☆☆☆

تلخ گفتار کو اپنی نہ زباں کرنا ہے
سوچ لو کہنے سے پہلے جو بیاں کرنا ہے

☆☆☆

بہت سے راہبر آئے، بہت سے کارواں گزرے
مگر بیٹھا رہا در پہ ترے دریوزہ گر ہو کے

☆☆☆

دردِ جگر سے عرق جو دل کی جبیں پہ ہے
دام پہ میری آنکھ کے ٹپکے ہیں بار بار

☆☆☆

دوریاں اتنی بڑھیں، یاد بھی نہیں آتی
نام کی رہ گئی بس ان سے شناسائی اب

☆☆☆

ابیات

سکوں دل میں تھا مجھکو، میری زندگی بھی گنگناتی تھی
نہ جانے کس لئے میں آپ کی محفل میں آ بیٹھا

☆☆☆☆

دیکھ کر آئینہ، آنکھوں نے میری مجھ سے کہا
انقلابِ وقت کو کیا دیکھتا ہے وقتِ شام

☆☆☆☆

یہ ادا اُن کی قیامت سے نہیں کم دوستو
دل جلا کر پوچھتے ہیں کیا ہوا ہے آپ کو

☆☆☆☆

اپنی منزل کی طرف عشق کی پرواز تو دیکھ
دوڑ کے مجھ سے لپٹنے کے وہ انداز تو دیکھ

☆☆☆☆

وقت و حالات نے آخر کو بدل ہی ڈالا
مستقل ہم ہیں ہر اک رنگ میں، سمجھے تھے کبھی

☆☆☆☆

ابیات

کیفیت دل کی چھپائے سے کہاں چھپتی ہے
دردِ پنہاں مرا آنکھوں میں چھلک آتا ہے

☆☆☆☆

وعدہ مجھ سے نہ لو تم کو بھول جانے کا
نہ کرو پھر سے گناہ گار مجھے

☆☆☆☆

پکتی ہے فصل جب تو مہک پھیل جاتی ہے
دعوت فنا کی خوشۂ گندم سے آتی ہے

☆☆☆☆

بات کرنے کی وہ فرصت کیوں کبھی پاتے نہیں
یا الٰہی کس لیے وہ فون پر آتے نہیں

☆☆☆☆

دامنِ شمع میں رہتا ہے اندھیرا کیسے
میری آنکھوں تلک آتا وہ اُجالا کیسے

☆☆☆☆

ابیات

کھلیں ہیں پھول مگر موسم بہار نہیں
خزاں کے موڑ پہ آیا حیات کا پیغام

تھی عبادت جن کے دم سے زندگی
اُن کی ہم کو اب صدا آتی نہیں

یقیں ہے دل کو ہمارے کہ ہوئی غلطی
مگر امیرؔ یہ ہم سے کہا نہیں جاتا

ہنگامۂ حیات سے پایا نہ [illegible]
جینے کی آرزو میں مرے جا رہے ہیں

اے فکرِ روزگار بہت تھک گیا ہوں میں
دم بھر کو میرے پاؤں کی زنجیر کھول دے

سیّد جعفر امیر

ابیات

دل تو چاہتا ہے کہ لکھوں، خوب لکھوں ہاں مگر
وہ زباں لاؤں کہاں سے جسکا ہو تجھ پر اثر

☆☆☆

دل سے ہوں مجبور، اُس کی خیر میں کرتا ہوں پند
جانتا ہوں وہ نہ بدلا ہے نہ بدلے گا کبھی

☆☆☆

ہر 'شروع' کے بعد لازم ہے کہ ہوتا ہے 'تمام'
جس پہ لاحق یہ نہیں ہوتا، خدا کا ہے وہ نام

☆☆☆

بارِ خاطر ہوگا تجھ پر میرا شکوہ، کیا کروں
آہ دل کی اک شکایت بن کے لب پر آگئی

☆☆☆

مستوی بنیاد نہ ہو تو اُٹھے دیوار کج
خشتِ اول پائے کی رکھو بڑی ترتیب سے

☆☆☆

ابیات

اک بھول تھی جو غیر شعوری میں ہوگئی
ترکِ ادب میں آپ سے کرتا! مجال تھی

٭٭٭٭

نغمگی ہوتی ہے حساس سماعت کے لیے
بے اثر میری غزل آپ کی محفل میں ہوئی

٭٭٭٭

ترکِ آداب پہ دے مجھ کو نہ الزام کوئی
چشمِ آہو تھی مرے دل کے بہکنے کے لئے

٭٭٭٭

دشتِ ویراں ہے مگر میرے لئے ہے وہ چمن
پھول صحرا میں کھلے دیکھ، مہکنے کے لئے

٭٭٭٭

صاف گوئی اور وضاحت سے کرو حق کی بات
بات وہ چاہے زمانے کو گوارا نہ ہی

٭٭٭٭

ابیات

بیاں میں گر چہ نہیں ہے ہمارے جوش وخروش
ہمیں جو کہنا ہے، وہ غور سے سُنیں صاحب

☆☆☆☆

دل جو بھر جائے شاہراہوں سے
چل کے پگ ڈنڈیوں پہ تم دیکھو

☆☆☆☆

تابندہ تھی وہ تابہ سحر ایک رات کی
سیکھو شمع سے کچھ تو حقیقت حیات کی

☆☆☆☆

سمٹا تو نکتہ بن گیا، پھیلا تو کائنات ہوں
یعنی کہ اسکا نقش ہوں، یعنی کہ اسکی ذات ہوں

☆☆☆☆

حسن قدرت سے سکوں ملتا ہے گو دل کو امیرؔ
اپنی تنہائی میں ہو جاتا ہوں یادوں کا اسیر

☆☆☆☆

ابیات

شور کیسا ہو رہا ہے، ہے یہ ہلچل کس لئے
کیا یہاں سے آج گزرا ہے امیرؔ اسکا شباب

دو نہیں اپنے خیالِ خام کو مذہب کا نام
دل دُکھانا، کعبہ ڈھانا، یہ نہیں مومن کا کام

قسمت میں میری صحبتِ خاکِ وطن نہ تھی
آوارگی میں گردِ جہاں چھانتا رہا

لکھتے کہاں تھے عشق کے عنواں پہ ہم امیرؔ
’تیرا کرم کہ تو نے دیا دل دکھا ہوا‘
(فانیؔ کے مصرعے پر تضمین)

ابیات

(ذیل میں لکھے ہوئے ابیات نوجوانوں اور بچوں کی تربیت کے لئے ہیں)

راہِ پُرخار سے کتنا ہی گزرنا ہی پڑے
راستہ اپنے مکاں کا کبھی بھولو نہ امیرؔ

☆☆☆

بدی کی راہ پر، تو سوچ لے، او چلنے والے
ہمقدم ہے ترا فرزند بھی تیرے پیچھے

☆☆☆

دیکھو نیچا نہ کسی کو کہ برابر سب ہیں
اُسکی آنکھوں میں جسے مُنصفِ مُطلق مانا

☆☆☆

دین و زبان و ملک و قبیلے کے فرق سے
کیوں امتیاز کرتا ہے لوگوں کے درمیاں

☆☆☆

سمجھو کسی کو تم نہ حقیر اس جہاں میں
یہ فرق و امتیاز گناہِ کبیر ہے

☆☆☆

ابیات

مُخلص اُس سے بھی تم کو رہنا ہے
جو کہ اخلاص کے نہیں قابل

دُو توجہ امیؔر اُسکو بھی
جو کہ حالات کا ہے مارا ہوا

سودا اُس سے کبھی نہ کرنا تم
جسکو سوداگری کا طور نہ ہو

ترتیب کائنات کا عقدہ تو کُھل گیا
یارب، بشر کی ذات کو سمجھا نہیں کوئی

بگڑی باتیں بھی سُلجھ جاتی ہیں رفتہ رفتہ
جبکہ آدابِ تکلّم کو نہ بھولے انساں

☆☆☆

جلوۂ حُسنِ عُروس

دھواں سا عود کا، زلفِ دراز لہرائی
جبینِ ناز پہ کاکل کی ایک گھٹا چھائی
گھونگھٹ میں جیسے دھنک نور کی تجلی سے
تراشِ سنگ میں جیسے ہنر کی پرچھائی

خود ہی سنگھار کی زینت وہ بن گیا ظالم
عروسِ خلد کی جلوہ نما ہے زیبائی
حنا کی دستِ صبیحہ پہ سُرخ گُل کاری
تھی پائے سیمیں پہ پازیب کی بھی پیرائی

کلی انار کی جیسے سحر کے دامن میں
چٹک رہی ہے جو مرمر چمن میں شرمائی
ہوا ہے عقدہ کشا مدعا اس کی آنکھوں کا
کہ شمع جلنے کی وجہ ہمیں سمجھ آئی

ابیات

اگر خدا کی طرف سے ملے ہنرمندی
عمل سے اپنے کوئی شاہکار پیدا کر

☆☆☆☆

کسر سی رہ گئی تخلیقِ خلق میں یا رب
بشر کے خو میں یہ شیطان کیوں سمایا ہے

☆☆☆☆

چاہے ہزار بار بھی تم کامیاب ہو
لیکن یقین کُل نہ کرو اپنے آپ پر

☆☆☆☆

کاوش میں، جستجو میں جو دیکھو کسی کو تم
ہمت بڑھاؤ، کر نہ سکو اُس کی جب مدد

☆☆☆☆

کمر خمیدہ ہوئی یار تیرے سجدوں سے
مگر وفا پہ مری پھر بھی اعتبار نہیں

☆☆☆☆

ابیات

دینے سے پہلے قرض کے تم یہ بھی دیکھ لو
کردار اُسکا ضامنِ زر بھی ہے یا نہیں

☆☆☆☆

خیال جو بھی کرے یا مدد کرے کوئی
ادب یہی ہے کہ تحریر میں تشکّر ہو

☆☆☆☆

ہم نوا ہو، ہم پیالہ، ہم خیال
خواہشیں واجب، یہ سب انساں کی ہیں

☆☆☆☆

چادر سے آگے پیر نہ پھیلاؤ تم امیرؔ
ورنہ وبالِ قرض کے ہوجاؤ گے اسیر

☆☆☆☆

یہ مت کہو کسی کو کہ جانو ہو اُسکا درد
ردِ عمل کسی کا کبھی ایک سا نہیں

☆☆☆

ابیات

کیوں ضرورت کے ہوگئے ہو اسیر
قرض ہوتا ہے پاؤں کی زنجیر

☆☆☆

مُصلح کی پند سے نہ ہو ناراض اے امیؔر
ہوتی اَنا کے پیچھے حقیقت کچھ اور ہے

☆☆☆

شبِ دَیجُور سے ہوتی نہیں کم جہل کی رات
روشنی علم کی ہوتی ہے متاعِ دائم

☆☆☆

لازمی مشقِ سُخن ہے ہر کسی فنکار کو
دیکھئے ملتی جلا ہے اس سے ہی شہکار کو

☆☆☆

'میں' 'میں' سے اپنا ذکر کئے جا رہے ہیں آپ
اوروں کا درد و دُکھ بھی محسوس کیجئے

☆☆☆

ابیات

شہ دو گے اور بد کو برائی کے واسطے
اُس کے عمل کو جب بھی گوارہ کرو گے تم

☆☆☆

کربلا میں یہ دیا آلِ محمدؐ نے سبق
حوصلہ بد کو نہ دو، اُسکو گوارہ کر کے

☆☆☆

جاں دینے سے نہ پائے گا طغرائے امتیاز
دانش بھی اے دلیر، دلیری کے ساتھ ہو

☆☆☆

کسی کی نیکی کو سمجھ نہ اُسکی کمزوری
بہادری یہ نہیں، ہوگی اپنی نادانی

☆☆☆

اپنی ناکامی کا الزام نہ دے دنیا کو
تُو جسے کہتا ہے قسمت، ہے تیرا ردِ عمل

☆☆☆

ابیات

میری ہستی پہ سے چھا گیا ہے کون
سوزِ الفت جگا گیا ہے کون

☆☆☆☆

اگر خدا نے نوازا ہے تجھکو دولت سے
یہ جان اُس میں غریبوں کا حق بھی شامل ہے

☆☆☆☆

ذمہ داری ہو، کہ تنظیم ہو، مشقت کہ اصول
سیکھنا عہدِ لڑکپن میں ہے آسان اُنکا

☆☆☆☆

یقیں کریں نہ ہر اک بات کو جو سُنتے ہیں
کہ لوگ کہنے کو مطلب کی اپنی کہتے ہیں

☆☆☆☆

اگر جو نیت صادق نہ ہو، عمل بے سود
تلاشِ حق میں چلو تو، خدا بھی ملتا ہے

☆☆☆☆

ابیات

فرق اتنا کامراں، ناکامراں انساں میں ہے
ایک کرتا ہے عمل اور دوسرا صرف سوچتا

☆☆☆

فیصلہ جو کرو سمجھ کے کرو
رائے قائم کرو نہ جلدی میں

☆☆☆

پہلے اُسکے کہ 'ہاں' کہو کہ 'نہیں'
کہنے والے کو پورا کہنے دو

☆☆☆

دوستی گر تمھیں نبھانی ہے
ربط تم دوستوں سے رکھو امیر

☆☆☆

اپنے بچوں کی خیر خواہی میں
اُنکے اسکول کی کرو باتیں

☆☆☆

ابیات

ذوق و شوق اُنکا بڑھتا ہے
اپنے بچوں کی جب کریں تعریف

☆☆☆

جب بھی بچے منائیں سال گرہ
دو کتابیں تم اُنکو تحفے میں

☆☆☆

چاہے ہوں ہوش باختہ حالات
رکھو اپنے حواس تم قائم

☆☆☆

شرع دین کی، قانون کی تعلیم ہے یہی
جو بھی معاہدہ کرو، تحریر میں کرو

☆☆☆

جو گزرتے ہیں خطر سے ہو کر
معرکے سر وہ کیا کرتے ہیں

☆☆☆

ابیات

یہ بھی سیکھا ہے زندگانی سے
دل بہلتا ہے باغ بانی سے

☆☆☆

بیٹھے رہنے سے سَر نہیں ہو گی
وہ پہاڑی جسے ہے سر کرنی

☆☆☆

خواہ مخواہ رائے نہ دو، نکتہ چینی نہ کرو
بال آجاتا ہے شیشہ میں دوستی کے امیرؔ

☆☆☆

راستے کی مشکلیں، طُولِ سفر ہو جائے کم
ہمسفر ایسا ہو جو، ہو ہر ڈگر پر ہمقدم

☆☆☆

طاقت و دولت سے مل جاتی تو عزت ہے مگر
کیا ضروری ہے کہ ہم دل کا سکوں بھی پائیں گے!

☆☆☆

ابیات

مسئلہ جو سامنے ہے، کر توجہ اُس پہ تُو
دفترِ ماضی کو کھولے گا تو پائے گا نہ حل

دیکھ، رُک کر تو بھی کیسے ہل چلاتا ہے کساں
خوں، پسینہ کر رہا ہے تیری روٹی کے لئے

سنور کے تیرے لئے سامنے جب آئے کوئی
کرو سلیقے سے اُس یار کی تم دل جوئی

اپنے خوابوں کو بکھرنے سے بچائے رکھو
زندگی اُنکے سہارے سے گزرتی ہے امیرؔ

نیند و غذا کی، پیاس کی تکلیف گر نہ ہو
انسان سوچتا ہے کہ دنیا بری نہیں

Prof.

ابیات

قوم و تہذیب کی بقا کے لئے
پھر سے اُردو زباں کو اپناؤ

ماہر فن کے پاس بھی یہ دیکھا ہے
جواب ہوتے نہیں آپکے سوالوں کے

ہے محوِ خواب تخم بدی خاک ذہن میں
ایک بوند بھی پڑی تو شجر بن کے چھائے گا

Love is the most illogical of human emotions
But there-in we find the logic of life.

Dedication

This book is dedicated to the memory of my father and mother who were the reason I am.

ادائے شرمِ جنوں ساز نے بصد انداز
نگاہِ شوق کی کچھ اور آگ بھڑکائی
کمالِ حُسن سے، مسجود تھے ملائک بھی
ثبوتِ حق میں جہاں جلوہ گر تھی صناعی

فرشتے نغمہ سرا جیسے آسمانوں میں
فضا میں گونج رہا ہے سرورِ شہنائی
وہ آرہا ہے میری زندگی میں شرماتا
میں اُسکے حُسنِ مکمل کا اک تمنائی

یہ ارمغانِ حسیں دے کے اُو رحیم و کریم
ہر ایک دُعا کی مری تُو نے کی پذیرائی
مرے سُرور کا عالم نہ پوچھ اے ساقی
رسیلی آنکھوں کی خود دیکھ لے تُو گہرائی

☆☆☆

خوب صورت اور معیاری کتابیں
چھپوانے کے لئے

SHAHID PUBLICATIONS

شاہد پبلی کیشنز، نئی دہلی ۲

SHAHID PUBLICATIONS

2253, Resham Street, Kucha Chelan, Darya Ganj,
New Delhi-110002 (INDIA)
Ph.: (R) 91-011-23272724 (M) 91-09868572724
E-mail: shahidpublications@gmail.com
drshahidhusain_786@yahoo.co.in

ڈاکٹر انجم بارہ بنکوی: جعفر امیؔر نے اپنی نظموں کو جس انسانیت آمیز بصیرت سے سجایا ہے وہ دامنِ دل کو اپنی طرف کھینچتی ہیں۔ ہر چند وہ غزلیں بھی کہتے ہیں اور پوری فنکارانہ دیانت داری سے مگر ان کا اصل جوہر نظموں میں کھلتا ہے۔ نظم کا کوئی بھی عالمی انتخاب سید جعفر امیر کی نظموں کے بغیر نامکمل ہوگا۔

ڈاکٹر غلام حسین: امیؔر نے اچھوتے موضوعات کو جس انوکھے انداز میں نظم نگاری کا نمونہ پیش کیا ہے وہ شگفتہ اور پختہ ہے۔ اس کے تحت وہ عہد حاضر کا نظیر اکبر آبادی کہلانے کے مستحق ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ ان کی شاعری میں اردو زبان اور ادب کی سچی روح جلوہ گر ہے۔ ان کی شعری کاوش نفیس زبان و بیان کی عبارت ہے نیز ریاضت اور مہارت کا آئینہ دار ہے۔ ان کی شاعری میں سوز و گداز کی حدّت اور احساسات کی صداقت، سبحان اللہ۔

محمد ادریس موتؔس: انکے نظم کے نمونے دیکھ کر جوش ملیح آبادی کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ ان کا نمونہ کلام دیکھ کر مزید کلام پڑھنے کا اشتیاق پیدا ہوتا ہے جو خاص طور پر قابل مبارک باد ہے۔ جعفر امیؔر کے قطعات دیکھ کر مایوسی ہوئی۔ قطعات میں جولانی طبع جو نظموں میں ہے نظر نہیں آئی۔

نقوش نقوی۔ پاکستان: امیؔر کی جس خوبی نے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ انکے جذبات کی صداقت ہے۔ انکی نظمیں قومیت اور وطنیت کے احساسات سے سرشار ہیں اور انکی مثبت و تعمیری فکر کی نشان دہی کرتی ہیں۔

Ba-Range-Digar

(A Collection of Poems by)

Syed J. Amir

ISBN: 93-80279-12-4

SHAHID PUBLICATIONS

2253, Resham Street, Kucha Chelan, Darya Ganj, New Delhi-110002

Tel. : 011-23272724 Mob.: 9868572724 E-mail : shahidpublications@gmail.com

دولتِ رفاقت

دنیا کی کلفتوں میں جو اُلجھا ہوا تھا میں
بختِ سیہ کو اپنی بہت کوستا تھا میں

مسکین تھا، میں صاحبِ جاہ و حشم نہ تھا
ظالم فلک سے اسکا سبب پوچھتا تھا میں

دولت کدوں کے عیش کو عشرت کو دیکھ کر
کم مائیگی پہ اپنی بہت کھولتا تھا میں

رنگ و طرب کی محفلِ یاراں کو دیکھ کر
اُن کی طرح ہوں، خواب یہی دیکھتا تھا میں

شاعر ہوں، فن پرست ہوں، معروف و معتبر
میں وہ ہوں، جو نہیں تھا، بہت سوچتا تھا میں

لیکن جو تو ملا تو رہا کوئی غم نہیں
میرا مقام اب تو شہنشاہ سے کم نہیں

کنگھی

وہ زُلفوں کو اپنی یوں سُلجھا رہے ہیں
گھٹاؤں کو جیسے وہ بکھرا رہے ہیں

نہا کے چنبیلی کے منڈوے کے نیچے
بدن دھوپ میں اپنا گرما رہے ہیں

اُٹھا کر کبھی آئینہ دیکھتے ہیں
کبھی خود سے، لگتا ہے، شرما رہے ہیں

جھٹکتے ہیں بالوں کو جب سر جُھکا کے
فضاؤں میں موتی وہ برسا رہے ہیں

زمیں سے کہیں پیچ و خم چھو نہ جائیں
درازی سے زُلفوں کی گھبرا رہے ہیں

جلاتے انگیٹھی میں ہیں عود و عنبر
وہ زلفوں کو خوشبو سے مہکا رہے ہیں

وہ کنگھے سے بالوں میں خط کھینچتے ہیں
لٹوں کو بھی چہرے پہ بکھرا رہے ہیں

کئی پھول توڑے، پرویا، لگایا
گھٹاؤں میں کیا تارے اُگا رہے ہیں

اُٹھا کے چلے آئینہ ناز سے وہ
انہیں کوئی روکے، کدھر جا رہے ہیں

جھروکوں سے کھڑکی کے دیکھے کبھی تھے
وہ منظر ان آنکھوں میں لہرا رہے ہیں

پن گھٹ سے

سر پر گھڑا ہے ہاتھ میں ٹھلیا اٹھائے ہے
پن گھٹ سے آ رہی ہے طرف گھر کے جائے ہے

چلتی ہے وہ کہ شاخ لچکتی ہے پھول کی
ہلکا سا خم وہ ظرف اٹھانے سے کھائے ہے

دامن کو گھاگھرے کے سنبھالے ہے بار بار
پلّو کے ایک کونے کو منہ میں دبائے ہے

پوچھا سحر نے اٹھ کے گلِ نیم وا سے یہ
اے رونق بہار، ادھر کون آئے ہے

کھایا جو جھونک، خود کو سنبھالا ادا کے ساتھ
راہوں کی اونچ نیچ سے گھبرا سی جائے ہے

طاقت پہ مجھ کو اپنی بڑا ہی غرور تھا
حیراں ہوں کیسے بارِ گراں وہ اٹھائے ہے

زلفوں میں لگ کے اور بھی نرگس کو ناز ہے
گجرا بھی جنگلی پھول کا سر میں لگائے ہے

سرما کی پہلی دھوپ سا، گورے بدن کا رنگ
ہاتھوں میں نقشِ رنگِ حنا بھی لگائے ہے

احساسِ حُسن و ناز، نہ عشوہ ادا میں ہے
اس سادگی پہ شورِ قیامت اُٹھائے ہے

دیکھا جو اُس نے میری طرف شانِ ناز سے
دل نے تڑپ کے مجھ سے کہا، ہائے، ہائے ہے

پن گھٹ پہ جو امیرؔ نے دیکھا شباب کو
شہرِ بتاں کو چھوڑ کے جنگل میں آئے ہے

فہرست مضامین

فہرست	صفحہ نمبر	فہرست	صفحہ نمبر
سید جعفر امیر۔ شخص اور شاعر۔ ڈاکٹر انیس قدوائی	ق	موگرے کے پھول	۳۲
نظمیات	۱	پیش گوئی	۳۳
۱۔ جمالیات	۲	پیغامِ دیر رسا	۳۶
خوابِ سحر	۳	محبت سے فرار	۳۹
آخری ملاقات	۴	یادِ نا گہانی	۴۱
محبت خود آفت	۵	جہاں کے رنگ بدل گئے	۴۴
پہلی ملاقات	۶	ابتدائے عشق	۴۶
دمِ رخصت (آزاد نظم)	۷	گولکنڈہ کی ایک شام (آزاد)	۴۸
زمانہ تھا	۹	حسن قدرت اور حسن جاناں	۵۱
اگر تو ہے	۱۰	اثر رہنے دو	۵۲
دیدۂ حسرت	۱۲	گیت ۔۱۔ ہم کو چین نہ آئے	۵۴
اے میرے دوست	۱۳	گیت ۔۲۔ جب رات اندھیری	۵۶
پیار	۱۴	**۲۔ رنگ ہائے مواسم**	۵۷
بنجارہ پہاڑ	۲۲	ترشح	۵۸
جلوۂ حسن عروس	۲۵	کہرا	۵۹
دولتِ رفاقت	۲۷	آمدِ باراں	۶۰
کنگھی	۲۸	بادل	۶۱
پن گھٹ سے	۳۰	موسم برسات	۶۵

موگرے کے پھول

دے کے میں نے موگرے کا پھول اُس سے یہ کہا
دیکھ لے اس پھول میں اپنی شبیہ، اپنا جمال

جو مہک آتی ہے لیکن، وہ ہے میرے پیار کی
پوچھتی ہے آپ سے خوشبو کہ ہوگا کب وصال

ڈال کر اپنی جبیں پر بل وہ بولے ناز سے
ہے جوابِ مدّعا روشن تو نہ کیجئے سوال

بیت

لیں گے تجھ سے بھی نبٹ، گردشِ دوراں کہ ابھی
ہوگئی ہے میری اس وقت فلک سے حُجت

☆☆☆

پیش گوئی

رہِ حیات میں آخر وہ دن بھی آئے گا
خمارِ خوابِ جوانی اُتر بھی جائے گا

چمن سے فصلِ بہاراں چلی بھی جائے گی
گلوں کو روندتی، آخر خزاں بھی آئے گی

اُداس شامیں کبھی ہوں گی عمرِ پیری میں
نہ ہوگا دوست کوئی عالمِ اسیری میں

نگار خانۂ ماضی میں کھو بھی جاؤ گی
تھکن سے یاد کی خاموش سو بھی جاؤ گی

خیال آئے گا مرتے تھے کتنے دیوانے
شبابِ رفتہ پہ مرتے تھے کتنے پروانے

وہ حُسن و عشق کے اُٹھتے تھے کتنے افسانے
تیرے ہی ذکر پہ چلتے تھے کتنے میخانے

نہیں ہے آج کوئی جو شریکِ غم ہوتا
زوالِ حُسن پہ کوئی تو چشمِ نم ہوتا

کبھی یہ یاد بھی آئے گا اُن خیالوں میں
کسی نے چاہا تھا طفلی کے اُن زمانوں میں

ہوں کاغذات پُرانے تو میری نظموں کو
کبھی نکال کے پڑھ لینا میرے زخموں کو

عیاں یہ ہوگا صداقت تھی میری الفت میں
کہ تیری روح کو چاہا تھا تیری صورت میں

ہاں تیرا غم تھا مرا غم، خوشی، خوشی میری
کچھ ایسی تجھ سے تھی وابستہ زندگی میری

زوالِ حُسن جو آیا، بدل گئے اخدان
مگر نہ بھول سکا تجھ کو میں کسی عنوان

ہاں تیرا دل غمِ ہستی سے بے نیاز رہا
یہاں غموں کا فقط سلسلۂ دراز رہا

گلا مجھے نہ ہوا تیری بے وفائی کا
گیا وہ دور بھی اب میری نارسائی کا

یہی تھی رسمِ محبت ہر ایک زمانے میں
وفا ملی نہ کبھی حسن کے فسانے میں

بیت

وہ کہتے ہیں باتوں میں "یعنی" و "معنی"
کوئی بات شاید وہ سمجھا رہے ہیں

پیغامِ دیر رسا

پھر سے جینے کا یہ پیغام نہ آیا ہوتا
پھر سے خوابوں کو مرے یوں نہ جگایا ہوتا

تیرگی ہوگئی اب خوئے بصارت میری
پھر سے امید کا شعلہ نہ جلایا ہوتا

زندگی صحرا نوردی میں گزاری جس نے
پھر نہ منزل کا پتہ اُس کو بتایا ہوتا

فائدہ کیا جو دِکھاتے ہو سَوادِ منزل
آبلہ پا نہ کوئی دشت میں آیا ہوتا

عمر بھر ایسے ہی ہمدم کی رہی مجھ کو تلاش
جس نے دنیا کو مری آ کے سجایا ہوتا

چھیڑتا مجھ کو کبھی، ناز اُٹھاتا میرے
رُوٹھ جانے پہ کبھی، اُس نے منایا ہوتا

اپنی اُلفت کا کبھی مجھ کو دِلاتا وہ یقیں
خوفِ فردا کو مرے دل سے مٹایا ہوتا

لہلہاتے ہوئے کھیتوں سے گزر جب ہوتا
ڈھلتی شاموں میں کوئی گیت سنایا ہوتا

جب بھی بے باک نگاہوں کی جسارت ہوتی
شرم سے میں نے نگاہوں کو جُھکایا ہوتا

ہجر کے درد سے واقف تو ذرا ہوتے ہم
اس کے دیدار کا کچھ لطف اٹھایا ہوتا

وادی و دشت و جبل، اپنے وطن کے ہوتے
ہوتا اک کنج چمن، ساحلِ دریا ہوتا

ہوتی پہچان کہ ہم بھی ہیں کہیں کے باسی
کہہ کے مسکین نہ غیروں نے ستایا ہوتا

جو نہ ماں باپ کا سایا رہا سر پہ میرے
تو کسی پاک محبت کا ہی سایا ہوتا

خواب دیکھے تھے کبھی ایسے ہی نادانی میں
ایسے خوابوں کو نہ آنکھوں میں بسایا ہوتا

اب خزاں رفتہ ہوں تاسیس محبت کیسی
اتنی تاخیر سے وہ اب تو نہ آیا ہوتا

دل کا سنتے ہیں کہ انجام برا ہوتا ہے
ہوتا بہتر کہ نہیں اپنا پرایا ہوتا

زندگی گزری تھی، کچھ اور گزر ہی جاتی
یوں نہ قسمت نے مجھے اُس سے ملایا ہوتا

ہے محبت میں روایت جو نہیں رونے کی
خونِ دل یوں نہ سرِ عام بہایا ہوتا

☆☆☆

محبّت سے فرار

غم اس کا ہے مجھے، آج مرے دل کا سکوں
میرے بچپن کی محبت کا وہ نابینا جنوں

تیرے ہر وعدۂ فردا پہ یقیں کرتا تھا
بے نیازی کو بھی، میں حُسنِ ادا کہتا تھا

کیا یہ معلوم تھا بدلیں گے خیالات ترے
تیرے جذبے، تیرے افکار، مقالات ترے

تھوڑی سی گرمئی دوراں سے پگھل جائیں گے
پھول اس طرح سے کانٹوں میں بدل جائیں گے

اک زمانہ تھا تمنا تھی تری بانہوں کی
میری راتوں کو تسلی تھی ترے خوابوں کی

میری ہر صبح میں روشن تھا تیرا خوابِ جمال
تری آواز سے جاگے تھے مرے فکر و خیال

تیرے ملنے پہ یہ سمجھا تھا ملی مجھ کو حیات
مرے معبود نے سُن لی ہے مرے دل کی بات

کیا کمی تو نے محبت میں مری پائی تھی
میری دنیا میں بھلا کیوں تُو چلی آئی تھی

میرے ہر جذبۂ اُلفت کو مٹایا تُو نے
نقص مجھ میں، میری ہر بات میں پایا تُو نے

کیا خبر تھی کہ وفا کا یہ صلہ پاؤں گا
آگ اس طرح سے بھڑکے گی کہ جل جاؤں گا

اب تیری بزمِ حسیں میں نہ کبھی آؤں گا
میں بہت دُور، بہت دُور چلا جاؤں گا

☆☆☆

یادِ ناگہانی

ناگہاں یاد تیری شب کو جو بیدار ہوئی
ہو کے بے تاب کہا دل نے، ستم گار ہوئی

دل کو دیکھا جو پریشاں تو خرد نے پوچھا
طاقتِ ضبط تری کیوں نہ مدد گار ہوئی

ہم تو سمجھے تھے ترا عشق سے ناطہ چھُوٹا
پھر وہی یاد دگر پیکرِ آزار ہوئی

پھر خیالوں میں اُسی کو ہے بسایا تو نے
پھر وہی یادِ بتاں تجھ پہ گراں بار ہوئی

تجربوں نے بھی تجھے کچھ نہ سکھایا اے دل
اے مرے یار، یہی بھول کئی بار ہوئی

صفحہ نمبر	فہرست	صفحہ نمبر	فہرست
۱۳۱	۴۔ خود بینی	۷۴	موسمِ بہار
۱۳۲	عطف	۷۷	موسم [illegible]
۱۳۶	ایک تمنا	۸۰	موسمِ خزاں
۱۳۸	عذرِ لنگ	۸۴	موسم [illegible]
۱۳۹	گھے پتے	۹۱	۳۔ رنگ ہائے نظائر
۱۴۰	تکرارِ دستورِ زماں	۹۲	[illegible] کے وقت
۱۴۱	بدلتی صورتیں	۹۳	چاندنی رات میں [illegible]
۱۴۲	شہرت کی خواہش	۹۵	[illegible]
۱۴۴	پھولوں کی زبان	۹۷	[illegible]
۱۴۵	ماحول کا اثر	۹۹	[illegible]
۱۴۶	سکونِ تنہائی	۱۰۱	[illegible]
۱۴۸	تلاشِ جہانِ ناپید	۱۰۴	[illegible]
۱۵۰	[illegible]	۱۰۷	[illegible]
۱۵۲	[illegible]	۱۰۹	[illegible]
۱۵۴	[illegible]	۱۱۱	[illegible]
۱۵۷	[illegible]	۱۱۳	[illegible]
۱۵۹	[illegible]	۱۱۵	[illegible]
۱۶۱	[illegible]	۱۱۹	[illegible]
۱۶۳	[illegible]	۱۲۲	[illegible]
۱۶۵	۵۔ ذکرِ اقربا	۱۲۴	[illegible]
۱۶۶	[illegible]	۱۲۸	[illegible]

کیا تیرے واسطے روشن نہ ہوئے بُت خانے
کیا نہ اِکسیر تجھے بادۂ سرشار ہوئی

وہ تری حُسن پرستی کو ہُوا کیا آخر
کیوں تری شوخ مزاجی کو یہ آزار ہوئی

دیکھ، تارے بھی نکلتے ہیں تو وہ تیرے لئے
دیکھ، چلتی ہے صبا، جیسے کہ مے خوار ہوئی

شمع جلتی ہے تری شب کو چراغاں کرنے
ہے وہی ساتھ ترے، جو تری غمخوار ہوئی

مہرباں تجھ پہ ہے یہ سارا شبستاں، ناداں
رقصِ پاکوب سے پازیب کی جھنکار ہوئی

جی لگانا ہو تو ہر حال میں لگ جاتا ہے
محفلِ غیر ہو یا رونقِ بازار ہوئی

عقل کی بات سُنی جب، دلِ بسمل نے کہا
پھر وہی خُوئے محبت مری بیدار ہوئی

وہ مری پہلی محبت کا جُنوں باقی ہے
اک وہی یاد ہمیشہ ہی گراں بار ہوئی

☆☆☆

قطعہ

جب یہ دوستی دیکھی کہ قربت ہے نہ دوری ہے
سفینہ بہہ رہا ہو جیسے بے مقصد سمندر میں
گھٹائیں جس طرح آکے گزر جائیں بنا برسے
کہ جیسے دے کے دستک کوئی نہ آئے مرے گھر میں

جہاں کے رنگ بدل گئے

وہ جو بات تھی نہ وہ بات ہے
نہ وہ دن رہے نہ وہ رات ہے
نہ وہ سوز و سازِ حیات ہے
نہ وہ حُسنِ شعلہ صفات ہے

وہ عمل، وہ ردِ عمل گئے
جو جہاں کے رنگ بدل گئے

مرے دل میں ہوک سی اُٹھتی تھی
مری سانس سینے میں گھُٹتی تھی
تیرا نام لب پہ جو آتا تھا
ترے غم میں ڈُوب سا جاتا تھا

وہ بدل گئے، کہ سنبھل گئے
جو جہاں کے رنگ بدل گئے

کبھی دل میں میرے وہ آئے تھے
وہ ہزار خوشیاں بھی لائے تھے
تھیں قدم قدم نئی رنجشیں
تھیں حجاب و شرم کی بندشیں

مجھے چھوڑ کر وہ نکل گئے
جو جہاں کے رنگ بدل گئے

نہ تو عشق میں مرے تھی کمی
نہ وفا میں اُس کے رہی کمی
جو ہے بیکراں، وہ سفر ہے یہ
جو نہ ختم ہو، رہ گزر ہے یہ

مرے دل کے پھول بھی جل گئے
جو جہاں کے رنگ بدل گئے

☆☆☆

ابتدائے عشق

ادائے محبت سے دیکھا جو اس نے
رنگیلے رنگیلے، سنہرے سنہرے

مسرت کے جالے بنے جا رہے ہیں
تمنا کو تاباں کئے جا رہے ہیں
شرارے سے دل میں اٹھے جا رہے ہیں

عجب کیفِ مستی کا عالم ہے چھایا
مرے گھر میں پھولوں کا موسم ہے آیا

ہوا کی طرح جو اڑے جا رہے ہیں
اڑے جا رہے ہیں، بہے جا رہے ہیں
خبر کیا کہاں ہم چلے جا رہے ہیں

وہ سننا، سمجھنا کہاں اب ہمارا
وہ رکنا، سنبھلنا کہاں اب ہمارا

جنونِ محبت سے گھبرا رہے ہیں
محبت کے کیسے مزے آرہے ہیں
گلستاں میں غنچے کھلے جارہے ہیں

نہ دردِ جگر ہے نہ غم کوئی ہمکو
پریشاں کرے نہ ستم کوئی ہمکو

شراب محبت پیئے جارہے ہیں
مزے میکشی کے لئے جارہے ہیں
انہیں کے لئے اب جئے جارہے ہیں

نہ منزل کی حسرت نہ رستوں کی پروا
وہ میرا ہے رہبر تو رہزن کا ڈر کیا

خراماں، خراماں چلے جارہے ہیں
دیئے راستوں میں جلے جارہے ہیں
لئے دل میں ارماں، بڑھے جارہے ہیں

گولکنڈہ کی ایک شام (آزاد)

سرمئی شام ہوئی، اے جانِ جہاں چلتے ہیں
ہاں کہیں دُور، کہیں دُور، جہاں فکرِ جہاں
ہم کو مغموم و پریشاں نہ بنائے رکھے
چلو! چلتے ہیں جہاں عہدِ جوانی میں کبھی
کتنی ارمان بھری شامیں گزاری تھیں جہاں
وعدۂ وصل کئے اور قسم کھائی تھی
ہاں، اُسی اُجڑے ہوئے گُنبدِ کُہنہ کے تلے
دُور تک پھیلے سرابوں کا نظارہ دیکھیں
دشت سے آتی ہواؤں کا خراماں دیکھیں

آؤ دیکھیں گے سرِ شام اُسی وادی میں
کس طرح وقت گزرتا رہا ویرانوں میں
کس طرح شام کی کرنیں ہیں جو رفتہ رفتہ
آخری بار اُترتی ہیں یہاں زینوں سے

در و دیوار، وہ ایوان، دریچے وہ محل
وہی اُفتادہ و بوسیدہ و مفلوک کھنڈر
گردشِ وقت سے کیا اب بھی لڑے جاتے ہیں

آو، بیٹھو تو یہاں، اُن کی کہانی تو سُنو
کتنے مجنوں جو یہاں چاک گریباں نکلے
کتنی لیلاؤں کی پیاسی وہ تڑپتی رُوحیں
ان ہی آوارہ ہواؤں کی طرح پھرتی ہیں
گل و گلزار یہاں محوِ بہاراں تھے کبھی
موگرے اور چنبیلی کی مہک بھی ہوگی
دامنِ حسن سے پھیلی ہوئی ایوانوں میں

شام اب ڈھل بھی چکی، سو بھی گئے نظارے
چادرِ عرش پہ پھیلے ہیں چمکتے تارے
جھلملاتے ہیں کہیں دور سے بستی کے نشان
پھر کھجوروں کی قطار اور پپیتوں کے درخت

ان ہی مٹی کے مکانوں سے بلند ہوتے ہیں
کچھ دھواں اُٹھتا ہے چپکے سے فلک کی جانب
پیچ و خم کھاتا کویلو کی چھتوں سے اوپر
آہِ بیکس کی طرح عرش رسا ہوتا ہے

صدیاں بیت گئیں، لمحۂ روشن نہ ملا
اور اس انداز سے پھر شامِ غمِ دوراں بھی
ان ہی ویرانوں میں چپکے سے چلی آئی ہے
آج گو اس کا یقین ہے میرے ہمدم میرے دوست
کہ ہمیں مل نہ سکے گا کبھی وہ رازِ خوشی
دن اور رات کی آمد کا پتہ، اس کا سراغ
پھر بھی ہستی کو مری تجھ میں پگھلتے دیکھا
یہ بھی محسوس کیا آج اس ویرانے میں
اسی اُجڑے ہوئے گنبد کے تلے، صحرا میں
کئی صدیوں سے یہاں ملتا رہا ہوں تم سے

☆☆☆

حُسنِ قدرت اور حُسنِ جاناں

عشقِ پیچاں کو ہواؤں میں لچکتے دیکھا
لالہ زاروں کو بہاروں میں مہکتے دیکھا
بستہ کلیوں کو سحر گہہ میں چٹکتے دیکھا
ماہ و انجم کو اندھیروں میں چمکتے دیکھا

مگر

شاخِ پیچاں میں نہیں زلفِ پریشاں کی لچک
گُل و لالہ میں نہیں سرخیٔ عارض کی جھلک
کھلتی کلیوں میں کہاں اسکی جوانی کی دھنک
ماہ و انجم میں نہیں پائی نگاہوں کی چمک

صفحہ نمبر	فہرست
۱۶۸	بیٹی کا دل دکھانے پر
۱۷۰	ماں کی یاد
۱۷۱	منہ موڑ کے نہ جاؤ اے ماں
۱۷۱	شب انتقال
۱۷۲	ماں کی رحلت پر
۱۷۵	وقتِ پیری
۱۷۷	پیرانہ سالی
۱۷۸	بسترِ مرگ
۱۸۱	ابا کے انتقال پر
۱۸۳	خواب کے گوشوں میں
۱۸۵	دواخانے سے
۱۸۸	**۶۔ ذکرِ دنیا**
۱۸۹	بازگشت
۱۹۰	نیند
۱۹۱	تمکنت
۱۹۲	یادِ طفلی
۱۹۵	یادِ وطن
۱۹۸	قندیل
۲۰۰	بخار
۲۰۶	سہیلی کے نام
۲۰۸	پتنگ
۲۰۹	چراغ
۲۱۰	پرانے گھر
۲۱۳	بچپن کا گھر
۲۱۴	غیر سے دل کی بات
۲۱۵	قدرِ صحت
۲۱۷	لفظ کی چارہ گری
۲۱۹	تصوف
۲۲۰	نصب العین
۲۲۳	فلسفۂ حیات
۲۲۴	دروغ کی شکلیں
۲۲۵	چغل خور
۲۲۷	بحث برائے بحث
۲۲۹	گردشِ دوراں
۲۳۰	**۷۔ وطن، مذہب، ملت**
۲۳۱	جلوۂ طور
۲۳۲	وطن کے لئے دعا
۲۳۴	وطن لوٹنے پر
۲۳۵	قرطبہ کی مسجد میں
۲۳۷	بابری مسجد
۲۴۰	روحِ ابن بطوطہ کا خطاب
۲۴۳	طاقتِ اتحاد

اثر رہنے دو

دردِ دل ہے یہ مرا خونِ جگر، رہنے دو
ہوتی آئی ہے مری یونہی بسر، رہنے دو

اب تو ملتا ہے سکوں مجھ کو خزاں زاروں میں
یہ خزاں زادہ مرے برگ و شجر رہنے دو

اُسکی سوغات تھی جو دل سے لگائے رکھی
اُسکی دیرینہ جفاؤں کا اثر رہنے دو

غم کی مضراب سے ہے بربطِ تخلیق میں ساز
اس بہانے مجھے آزردہ بشر رہنے دو

اُسکی خوشبو کبھی آتی ہے، کبھی اُسکی ندا
اُسکی یادوں کا مرا زادِ سفر رہنے دو

دم جو گھٹتا ہے کبھی رات کی تنہائی میں
چمک اُٹھتے ہیں مرے علم و ہنر، رہنے دو

اب نہیں کوئی مجھے عیش و طرب سے مطلب
خون رونے کو مرے دیدۂ تر رہنے دو

امتحاں تاب و تواں کا مری لیتا رہے چرخ
جو بھی پہنچا ہے مرے دل کو ضرر، رہنے دو

صدفِ شعر میں پنہاں ہے مرا دردِ جنوں
گنجِ ہستی کے یہ دو چار گہر رہنے دو

رنگِ لالہ میں بھی شاید ہے کسی دل کا لہو
میرے نغموں میں مرا دردِ جگر رہنے دو

اس عنایت کی نظر سے میں نہیں ہوں مانوس
وہ جو ڈالی تھی تغافل کی نظر، رہنے دو

میرے اس گوشۂ عزلت کو بچاؤ نہ امیر
آگ لگتی ہے مرے گھر میں اگر، رہنے دو

گیت ۔۱۔ تم بن برکھا آگ لگائے

تم بن ہم کو چین نہ آئے
تم بن جیارا بیٹھا جائے
کوئل بن میں شور مچائے
پل پل تیری یاد دلائے

تم بن برکھا آگ لگائے

اودے اودے بادل چھائے
رِم جھم رِم جھم مینہہ برسائے
بادل گرجے، دل گھبرائے
من کا پنچھی تڑپا جائے

تم بن برکھا آگ لگائے

کل کے اپنے، آج پرائے
مَن دُکھیارا، نیر بہائے
اُس کو کھو کر چین نہ پائے
در پر بیٹھی، نین لگائے

تم بن برکھا آگ لگائے

گیت ۔۲۔ جب یاد کسی کی آتی ہے

جب رات اندھیری چھاتی ہے
جب یاد کسی کی آتی ہے
جب نیند مری اڑ جاتی ہے
جب کوئل بن میں گاتی ہے

انگ سارا میرا دکھتا ہے
دل چلتے چلتے رکتا ہے

جب رات اندھیری چھاتی ہے
جب برکھا مینہ برساتی ہے
جب سوندھی خوشبو آتی ہے
جب ساری دنیا سوتی ہے

وہ چپکے چپکے آتے ہیں
اور گیت مدُھر وہ گاتے ہیں

☆☆☆

نظمیات:

رنگ ہائے مواسم

حُسنِ قدرت کے اِن مناظر کا
ایک نقشہ بنا رہا ہوں میں
پھر شبستانِ ریختی میں امیرؔ
ایک دیپک جلا رہا ہوں میں

ترشح

ترشح ہلکا ہلکا ہو رہا ہے
سکوتِ شب میں عالم سو رہا ہے

ہوائیں ہولے ہولے چل رہی ہیں
گھٹائیں آسماں سے ڈھل رہی ہیں

فضا میں ایک خنکی سی رواں ہے
وہ شدت گرمیوں کی اب کہاں ہے

وراندے میں پڑا میں سو رہا ہوں
نشاطِ بے خودی میں کھو رہا ہوں

خیالِ دورِ ماضی آ رہا ہے
مرے جذبات کو گرما رہا ہے

☆☆☆

کُہرا

صبح کی دُھند سے محدود ہوئیں یوں نظریں
ململی سُوت کا ہے سُرمئی پردا جیسے
ہوگئے بستی و صحرا کے نشاں بھی اوجھل
شبنمی فرش سے ملتے ہیں یہ بادل ایسے

بدلے بدلے نظر آتے ہیں یہ جانے منظر
خواب میں جیسے حقیقت کا سفر ہوتا ہے
ہیں مُصوّر کے تخیّل کے یہی نقش و نگار
قلب شاعر پہ عجب اِنکا اثر ہوتا ہے

اور بڑھ جاتا ہے تنہائی کا احساس یہاں
سوچتا ہوں کہ اکیلا ہوں، میں جاؤں تو کہاں

☆☆☆☆

آمدِ باراں

فصیلِ کوہ کے آگے، ذرا بلندی پہ
نظر کچھ نقشِ رواں بادلوں کے آتے ہیں
بہت جو سُوکھ چکی تھی زمیں تو اُس کے لئے
نویدِ رنگِ بہاراں، وہ پھر سے لاتے ہیں

فضا جو دیر سے معتوبِ فصلِ گرما تھی
وہ انتظار میں بیٹھی تھی آبِ باراں کے
کہیں نظر کا نہ دھوکا، سراب ہو نہ کہیں
نہیں یہ راہ گزرنے کی، آبِ نسیاں کے

ہاں آئی ہلکی سے خنکی، ہوائے صرصر میں
بدل گیا ہے سماں اس رُت کے بدلنے سے
ہوا میں پھیل گئی سُوندھی، سُوندھی خوشبو سی
مہک اٹھی ہے فضا مینہ کے برسنے سے

☆☆☆

بادل

اُدھر دیکھو بادل گھرے آ رہے ہیں
فلک پر وہ امنڈے چلے آ رہے ہیں
پرے در پرے جھومتے آ رہے ہیں
یہ بادل کہاں سے اُڑے آ رہے ہیں

شکم سے سمندر کے پیدا ہوئے جو
یہ لہروں کی صورت ہُویدا ہوئے جو
وہ دوش ہوا پہ پریدہ ہوئے جو
یہ بادل کہاں سے اُڑے آ رہے ہیں

اُفق پر بگولوں کی صورت وہ اُبھریں
فلک پر بڑھیں جیسے طوفاں کی موجیں
ہواؤں کے جھکڑ میں خنکی کی لہریں
یہ بادل کہاں سے اُڑے آ رہے ہیں

فہرست	صفحہ نمبر
نوجوانوں کو ہدایت	۲۴۴
نوجوانوں سے خطاب	۲۴۵
آزادی کا راستہ	۲۴۸
غیرت کی تنبیہ	۲۴۸
کشمیری مجاہدین کی [illegible]، اپنی زبانی	۲۴۹
مجاہد کا فخر	۲۴۹
تاثرات از سانحہ ۱۱ ستمبر ۲۰۰۱ء	۲۵۱
[illegible]	۲۵۴
[illegible]	۲۵۶
[illegible]	۲۵۷
[illegible]	۲۵۹
[illegible]	۲۶۲
[illegible]	۲۶۴
۸۔ منقبت	۲۶۵
[illegible]	۲۶۵
[illegible]	۲۶۶
[illegible]	۲۶۷
غزلیات	۲۶۸
[illegible]	۲۶۹
[illegible]	۲۷۰
[illegible]	۲۷۲

فہرست	صفحہ نمبر
دھواں سا عود کا، زلف دراز لہرائی	۲۷۴
نہ دن اپنا، نہ شب اپنی	۲۷۶
اس دل کی تڑپ اور ہے	۲۷۸
وقت رخصت ہائے اُن کی	۲۸۰
کب سے ترے خیال میں	۲۸۲
وعدہ جو کیا تھا وہ نبھایا نہیں جاتا	۲۸۴
وہ جوانی نہ رہی، اب وہ زمانے	۲۸۷
چمپئی رنگت ہے جیسے	۲۸۹
انجام غم کی دل کو خبر کر چکے ہیں ہم	۲۹۱
یاد آتی ہیں ابھی تک	۲۹۳
پھر مرے دل میں تری	۲۹۴
جو ہے باطن، جو پردہ اور ہے	۲۹۵
ہوئی سحر تو شب غم کا اضطراب نہ تھا	۲۹۸
چاند کا [illegible] ان کی یاد آئی	۳۰۰
اب میرے بعد اُن پہ [illegible]	۳۰۲
اقرار وفا تیرا اُٹھانے [illegible]	۳۰۴
[illegible]	۳۰۶
[illegible]	۳۰۸
دل کی دنیا [illegible]	۳۱۰
[illegible]	۳۱۲
[illegible]	۳۱۳

وہ آتے ہیں کیسا ادھم سا مچاتے
گرجتے برستے وہ بجلی گراتے
وہ زورِ خدائی کے جوہر دکھاتے
یہ بادل کہاں سے اُڑے آرہے ہیں

بڑھا آگے طوفاں لئے اک طلاطم
کڑکنے پہ بجلی کے دنیا ہو گُم صُم
اس غیض و غضب سے دہل جائے رستم
یہ بادل کہاں سے اڑے آرہے ہیں

جو برسے تو رنگیں ہوئی زندگانی
جو سُوکھی زمیں تھی، دیا اُس کو پانی
گُلوں کو، چمن کو، دی پھر سے جوانی
یہ بادل کہاں سے اُڑے آرہے ہیں

کہیں ہلکے ہلکے کہیں گہرے گہرے
کہیں نیلے پیلے، کہیں اودے اودے
کہیں گاڑھے گاڑھے، کہیں سلسلے سے
یہ بادل کہاں سے اڑے آ رہے ہیں

کبھی دیکھنے میں ہیں روئی کے گالے
کبھی کامدانی کے جیسے ہوں جالے
درخشاں قمر ہو تو بن جائیں ہالے
یہ بادل کہاں سے اڑے آ رہے ہیں

وہ برجِ فلک پر رواں ہیں دواں ہیں
ابھی کچھ یہاں ہیں، ابھی کچھ وہاں ہیں
وہ راسِ جبل سے کبھی ہم کناں ہیں
یہ بادل کہاں سے اڑے آ رہے ہیں

برس کر وہ دریا بنے جب زمیں پر
سمندر کو لوٹے نہ ٹھہرے کہیں پر
جہاں سے تھے نکلے وہ پہونچے وہیں پر
یہ بادل کہاں سے اُڑے آرہے ہیں

یہ طوفاں، یہ بادل مرے ہم زباں ہیں
یہ دریا، سمندر مرے راز داں ہیں
یہ مسجد ہیں میری، مری یہ اذاں ہیں
یہ بادل کہاں سے اُڑے آرہے ہیں

گرج کر، برس کر، بکھر سے گئے اب
یہ منظر جہاں کے نکھر سے گئے اب
تراوت سے گلشن، سنور سے گئے اب
یہ بادل کہاں سے اُڑے آرہے ہیں

☆☆☆

موسمِ برسات

خار و خس، گرد و غبار و آفتاب تابناک
گرمیوں نے کردیا ہے ہر گل و گلزار خاک

سبزہ گاہ و آبگیر و ندیاں بے آب و جاں
تشنگی سے اپنا منہ کھولے ہوئے مرغابیاں

مئی کا تھا یہ مہینہ، جل رہا تھا آسماں
آئیں گی اب دھیرے دھیرے موسمی تبدیلیاں

آگیا ہے زاویہ پر اُس جگہ چرخِ فلک
اب نہیں ہے دیر کچھ، برسات کے ہونے تلک

یہ نظامِ سرمدی ہے جو کہ عالمگیر ہے
موسموں کا آنا جانا قدرتی تدبیر ہے

جب اُٹھا کے اپنا خیمہ گرمیاں جانے لگیں
وہ اُفق پر بادلوں کی ٹولیاں آنے لگیں

جُھوم کر بادل اُٹھے اور آسماں پر چھا گئے
گرمیاں جانے لگیں، دن بارشوں کے آ گئے

بادلوں کی گڑ گڑاہٹ دُور سے آنے لگی
آسماں کو برقِ باراں پھر سے چمکانے لگی

چُھپ گیا سورج، بڑھے جو بادلوں کے قافلے
اُودے اُودے، کالے کالے، بھورے بھورے سلسلے

کھِنچ گیا پردا زمین و آسماں کے درمیاں
آ گئیں پھر سرسراتی نرم و نازک خُنکیاں

روحِ انساں اِک شِگُوفے کی طرح کِھلنے لگی
دھیرے دھیرے جب ہوائے شبنمی چلنے لگی

ہر گرج میں آ رہی ہے پھر نوائے زندگی
مرحبا! کیا پُر فضا ہے یہ ادائے زندگی

گڑ گڑاہٹ بڑھ رہی ہے، برق بھی ہے کچھ نہ کم
بادلوں میں جوشِ طوفاں مثلِ دریا پیچ و خم

ہیں عناصر انقطاعِ مطر کو ظاہر کیے
ہے تقاطرِ پیشِ باراں کچھ ہوائیں بھی لیے

آ گئی ہے اب فضا میں پھر نشاطِ زندگی
موسمِ باراں کی پہلی ہو گئی بارندگی

ٹپ ٹپا ٹپ کی صدا میں نغمگی ہونے لگی
شانِ قدرت تجھ سے تخمِ زندگی بونے لگی

دفعتاً جھکڑ چلے اور جھکڑوں کے ساتھ ساتھ
ڈھل رہی تھی آسماں سے بادلوں کی کائنات

نہر اور نالے بھی جو سوکھے پڑے تھے دیر سے
چل پڑے ہیں لے کے آگے خار و خس کو گھیر کے

زورِ بارش تھا کہ ٹوٹا پڑ رہا تھا آسماں
بڑھ رہا تھا لمحہ لمحہ بادلوں کا کارواں

مچ گئی بھگدڑ سی بستی میں جو ٹوٹا آسماں
لوگ بھاگے جا رہے ہیں جس طرف ہے سائباں

سر پر اپنا ہاتھ، کاغذ، دستیاں رکھے ہوئے
لے کے دیواروں کا سایا، سُکڑے سمٹے، چل پڑے

کچھ دکانوں میں چلے آئے ہیں پانی پونچھتے
بھیگے کپڑوں کو، کبھی ہیں آسماں کو دیکھتے

تھم گیا ہر کاروبارِ زندگی کا سلسلہ
اب نہ عجلت ہے اُنہیں، نہ دیر ہونے کا گِلہ

جو پرندے اُڑ رہے تھے چُھپ گئے اشجار میں
ہیں اُچکتی مچھلیاں ہر موج پر، منجھدھار میں

سائبانوں سے گرے قطرے، بنے افراسِ آب
دُو گھڑی کی زندگی کا دیکھئے یہ اضطراب

ہر حبابِ آب دیتا ہے سبق انسان کو
زندگی کی بے ثباتی کی حقیقت جان لو

دُھل گیا چہرا زمین و آسماں کا آب سے
پہلی بارش میں ہی منظر ہوگئے شاداب سے

جس طرح بھٹکا مسافر، دشت سے لوٹا ہوا
غسل لے کے آگیا، پہنے ہوئے اُجلی قبا

دفعتا بادل چھٹے اور تھم گیا پانی کا شور
گڑگڑاہٹ کم ہوئی، کم ہوگیا بجلی کا زور

زورِ بارش کم ہُوا، جھکڑ ہُوا کے کم ہوئے
کوہ ودشت وبرگ وگل اور خار وخس سب نم ہوئے

کالے کالے بادلوں کا قافلہ تھا جا چکا
گُلشنوں میں گیت گانے کا تھا موسم آچکا

ہو چکی جو پہلی بارش اس طرح بے اختیار
کوکتی ہیں کوئلیں جنگل میں کیسے بار بار

ٹولیاں لوگوں کی باغوں کی طرف جانے لگیں
بُلبُلیں بھی گلشنوں میں زمزمے گانے لگیں

گھاس پر دریاں بچھیں اور آم پر جُھولے پڑے
گا رہے تھے پینگ لے لے کر سبھی چھوٹے بڑے

ناریاں گانے لگیں کچھ ڈھول پر ساون کے گیت
یاد آتے ہیں سبھی کو اپنے اپنے مَن کے میت

جل گئے چولہے، کڑاہی چڑھ گئی ہے آگ پر
کچھ پکاتے ہیں تلن، کچھ گا رہے ہیں راگ پر

جب نکلتی ہیں زمیں سے بیر بہوٹی لال لال
اپنی مُٹھی میں لیے پھرتے ہیں دیکھو نونہال

میں بھی گُلشن میں کہیں اک پیڑ پر بیٹھا ہوا
یہ نظارہ دیکھتا تھا اپنا سر ٹیکا ہوا

ذہن کے گوشوں میں جیسے اک لہر اٹھنے لگی
نوجوانی یاد آئی، سانس بھی گُھٹنے لگی

وہ تبسّم، وہ ادائے دلبرانہ یاد ہے
جھولنا اُس کا، مرا اُس کو جُھلانا یاد ہے

ساتھیوں میں اس کا وہ گانا بجانا یاد ہے
جب نظر ملتی وہ اس کا مسکرانا یاد ہے